وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا

نومبر ۲۰۱۲ء

ماہنامہ

عالمی ترجمان القرآن

بیاد

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

الابلاغ ٹرسٹ

توسیعی منصوبہ الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن

سابق ناظم کراچی **نعمت اللہ خان کی اپیل**

محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الخدمت ہسپتال اورنگی ٹاؤن گذشتہ 15 سال سے ایشیا کی سب سے بڑی کچی آبادی اورنگی ٹاؤن اوراس کے ملحقہ آبادیوں، سائٹ اور بلدیہ میں لوگوں کی خدمت انجام دے رہا ہے۔اس وقت اس ہسپتال میں میٹرنٹی ہوم، آئی فیکو سرجری، ڈینٹل کے شعبہ جات کام کررہے ہیں نیز 26 کنسلٹنٹ اپنی خدمات انجام دیتے ہیں، علاقے کی سب سے جدید لیبارٹری موجود ہے۔اوسطاً روزانہ پانچ سو مریض مستفیذ ہورہے ہیں، مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور مزید سہولیات فراہم کرنے کے لئے اس کے توسیعی منصوبے کے تعمیراتی کام کا آغاز کررہے ہیں۔اس منصوبے پر اندازاً دس کروڑ روپے کا تخمینہ ہے۔ان شاءاللہ تعمیر مکمل ہونے کے بعد یہ ہسپتال علاقے کا جدید ترین ہسپتال ہوگا۔جس میں تمام سہولیات فراہم ہونگی۔

محترم خواتین وحضرات اس وقت بھی آپ کے دئے ہوئے عطیات سے خدمت انجام دے رہا ہے۔اور مجھے امید ہے اس منصوبے کی تکمیل تک آپ کا تعاون جاری رہے گا۔(ان شاءاللہ)

ملتمس

نعمت اللہ خان
سابق سٹی ناظم کراچی
سابق صدر الخدمت فاؤنڈیشن

برائے رابطہ

محمد اسحاق خان
امیر جماعت اسلامی ضلع غربی کراچی
وسرپرست اعلی الخدمت ہسپتال
موبائل نمبر۔ 03332205538

عزیر بیگ قاسمی
نائب امیر جماعت اسلامی ضلع غربی کراچی
نگران الخدمت ہسپتال
موبائل نمبر۔ 0301-2863828

محمد لئیق خان
ایڈمنسٹریٹر الخدمت ہسپتال/EX-MNA
موبائل نمبر۔ 0300-9240133

آن لائن اکاؤنٹ
نیشنل بینک آف پاکستان اورنگی
برانچ کوڈ۔ 1055 اکاؤنٹ نمبر۔ 4-1042





email: alkhidmathospitalorangi@gmail.com | Ph : 0213-6668893

ماہنامہ عالمی

ترجمان القرآن

جلد۲، عدد۱۱، ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ، نومبر ۲۰۱۲ء

مدیر: پروفیسر خورشید احمد　　نائب مدیر: مسلم سجاد

o اشارات

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ:

پاکستان اور افغانستان　پروفیسر خورشید احمد　۳

o مقالہ خصوصی

سیاسی تبدیلی اور معاشرتی انقلاب:

چند قابلِ غور پہلو　ڈاکٹر انیس احمد　۲۱

o تزکیہ و تربیت

حج اور عمرہ بطور ہجرت　"　۳۳

o اسلامی تحریکیں

اخوان المسلمون، مصر اور احیاے اسلام　ڈاکٹر شائستہ پروین　۳۹

o اقبالیات

اقبال اور سیکولرزم　بشیر احمد ڈار　۵۷

o یاد رفتگاں

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ　محمد عبداللہ جاوید　۶۷

ایک مردِ بے باک - راجا محمد ظہیر خانؒ　عمران ظہور غازی　۷۶

o عالمِ اسلام

شام: اسد خاندان کا مجرمانہ دورِ حکومت　ارشاد الرحمٰن　۸۱

o اخبار اُمت

خودمختار بنگسا مورو:

نئی اسلامی ریاست کا قیام!　محمد ایوب منیر　۸۹

o رسائل و مسائل　۹۳

o کتاب نما　۹۷

o مدیر کے نام　۱۰۷

☆☆☆

ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۷۹۰ فون: ۳۵۴۲۵۳۵۶-۰۴۲ فیکس: ۳۵۴۳۲۱۹۴ ای میل: tarjuman@wol.net.pk

انتظامی امور: ۶- صابر سٹریٹ، ڈیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - ۵۴۶۰۰ فون: ۳۷۵۰۲۰۴۸-۳۷۵۸۷۹۱۶-۰۴۲ فیکس: ۳۷۵۳۵۶۶۰

موبائل: ۴۱۱۲۷۰۰-۰۳۰۷ ای میل: tarjuman@tarjumanulquran.org ویب: www.tarjumanulquran.org

● قیمت فی شمارہ: ۳۵ روپے ● زرسالانہ: ۳۵۰ روپے ● ۵ سال کے لیے: ۱۵۰۰ روپے ● معاون خصوصی: ۶۰۰۰ روپے

● بنگلہ دیش، بھارت ۱۴۰۰ روپے ● ایران، مشرق وسطی، مشرق بعید، یورپ، افریقہ ۱۸۰۰ روپے ● امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا ۲۱۰۰ روپے

بنک اکاؤنٹ: بنام عالمی ترجمان القرآن، BOP, Ichhra, Br. Code 093, Lahore A/c 800-792-000-0

زیر اہتمام: الابلاغ ٹرسٹ

دینیات کی تعلیم کی تحقیر

ہم نے اپنے قومی خرچ پر جو درس گاہیں قائم کیں ان میں بھی ہم نے وہی سارا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جو سرکاری درس گاہوں میں تھا۔ ہم نے کوشش کی کہ ہمارے طلبہ انگریزی بولیں اور انگریزی لباس پہنیں۔ ہم نے کوشش کی کہ وہ انگریزی کلچر ہی کے رنگ میں رنگے جائیں۔ ہم نے کھیلوں میں اور نشست و برخاست میں اور رہنے سہنے میں اور مسائل پر مباحثوں میں، غرض ہر چیز میں یہی کوشش کی کہ ہماری یہ قومی درس گاہیں کسی طرح بھی سرکاری درس گاہوں سے مختلف نہ ہوں ..... اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ انگریزی معیار کے لحاظ سے سرکاری درس گاہوں سے نکلے ہوئے لوگوں سے کسی طرح بھی کم تر ہیں ..... اس ماحول کے اندر اسلام کی وہ ذرا سی قلم جو ہم نے لگائی وہ آخر اپنا کیا رنگ دکھا سکتی تھی۔ تعلیمی حیثیت سے وہ نہایت کمزور تھی۔ دوسرے کسی نصابِ تعلیم سے اس کا کوئی جوڑ نہ تھا..... اس پر مزید ستم ہم نے یہ کیا کہ اپنے قومی کالجوں میں بھی سرکاری کالجوں کی طرح زندگی کا پورا ماحول اور ذہنی تربیت کا پورا نظام ایسا رکھا جو اسلام کے اس کمزور سے پیوند کے بجائے فرنگیت اور الحاد کے لیے ہی سازگار تھا۔ اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جو اس پیوند کو غذا دینے والی ہو، بلکہ ہر چیز عین اس کی فطرت کے خلاف تھی۔

یہ سب کچھ کر کے ہم اس معجزے کی توقع رکھتے تھے کہ دینیات کی اس تعلیم سے حقیقت میں کوئی دینی جذبہ پیدا ہوگا، کوئی دینی رجحان نشوونما پائے گا، اسلام کی قدر و قیمت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوگی اور ان کے اندر اسلامی کیریکٹر پیدا ہوگا۔ حالانکہ قانونِ فطرت کے مطابق اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا اور یہی عملاً برآمد ہوا کہ جن طلبہ کو اس طریقے سے دینیات کی تعلیم دی گئی ان کی نگاہوں سے دین گر گیا اور ان کی دینی حالت مشن کالجوں اور گورنمنٹ کالجوں کے طلبہ سے بھی زیادہ بدتر ہوگئی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے کالجوں میں بالعموم دینیات کا گھنٹہ تفریح اور مذاق کا گھنٹہ رہا ہے اور اس نے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے بجائے رہے سہے ایمان کا بھی خاتمہ کر دینے کی خدمت انجام دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم خود اپنی اولاد کے سامنے اپنے دین کو تمام دوسرے مضامین سے حقیر تر بنا کر پیش کریں گے تو اس کی کم سے کم سزا جو قدرت کی طرف سے ہمیں ملنی چاہیے وہ یہی ہے کہ ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے ملحد اور زندیق بن کر اُٹھیں اور اپنے اُن بزرگوں کو احمق سمجھیں جو خدا اور رسولؐ اور آخرت کو مانتے تھے۔ ('اسلامی نظامِ تعلیم' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمان القرآن، جلد ۳۹، عدد ۲، صفر ۱۳۷۲ھ، نومبر ۱۹۵۲ء، ص ۶۲، ۶۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ
پاکستان اور افغانستان

پروفیسر خورشید احمد

قرآن پاک نے افراد اور اقوام کی زندگی میں بار بار واقع ہونے والی اس صورت حال کو بڑے مختصر مگر جامع انداز میں بیان فرما دیا ہے کہ انسان اپنے طور پر طرح طرح کی منصوبہ سازیاں اور تدبیریں کرتا ہے مگر بالآخر اللہ ہے جس کی تدبیر غالب ہوکر رہتی ہے۔ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ (اٰل عمرٰن ۳:۵۴)۔

پاکستان کی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کی کارفرمائی کا نظارہ ہم نے بار بار دیکھا ہے اور اس کی تازہ ترین مثال یہ ہے کہ امریکا کے صدارتی انتخاب کے فیصلہ کن مرحلے میں پاکستان کو شمالی وزیرستان پر فوج کشی کی آگ میں دھکیلنے اور اس سے امریکی ووٹروں کے دل جیتنے کا جو شاطرانہ منصوبہ بنایا گیا تھا وہ کانچ کے گھر کی طرح پاش پاش ہوگیا ہے۔

۱۴/اگست پاکستانی قوم کے لیے خوشی اور شکر کا ایک اہم موقع ہوتا ہے۔ اس سال عین اس دن، امریکا کے ڈیفنس سیکرٹری لیون پانیٹا نے امریکی عوام کو یہ مژدہ سنایا کہ پاکستان اور امریکا کی اعلیٰ فوجی اور سیاسی قیادت نے اس امر پر اتفاق کرلیا ہے کہ پاکستان شمالی وزیرستان میں جلد فوجی آپریشن شروع کردے گا اور اس طرح امریکی حکام کے الفاظ میں: ''تاریخ کے سب سے زیادہ عرصے تک مؤخر کیے جانے والے اقدام'' (most delayed operation) کا آغاز ہوجائے گا۔ اس کے لیے پاکستان پر دباؤ اور لالچ دونوں حربوں کے استعمال کے ساتھ امریکی

کانگریس کی طرف سے امریکی سیکرٹری خارجہ کو 'حقانی نیٹ ورک' کو افغانستان پر فوج کشی کے ۱۱سال کے بعد 'دہشت گرد گروہ' قرار دینے کا مطالبہ بھی داغ دیا گیا، اور وزارتِ خارجہ نے ۳۰ دن کے اندر اس راز کو، اس گروہ کے بارے میں جس سے سیاسی مذاکرات کے لیے سرتوڑ کوشش کی جارہی تھی فاش کردیا ہے جسے ۱۱سال سے اپنے سینے میں چھپایا ہوا تھا۔

یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ ۱۴/اگست ۲۰۱۲ء ہی کو کاکول اکیڈمی میں خطاب کرتے ہوئے پاکستانی فوج کے چیف آف اسٹاف جنرل پرویز کیانی نے پاکستان کی آزادی، سلامتی اور اسلامی شناخت کے بارے میں کچھ بڑی دل کش باتوں کے ساتھ بڑے چپکے سے یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ انتہاپسندی ایک قسم کا شرک ہے، دہشت گردی اسی ذہنیت کی پیداوار ہے، اور 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' دراصل امریکا کی نہیں ہماری اپنی جنگ ہے، اور ہے تو بڑا ہی مشکل اور تکلیف دہ کام، لیکن فوج کو خود اپنی قوم کے خلاف بھی لام بندی کرنا پڑجاتی ہے۔ البتہ اتنی گنجایش رکھی کہ اس کام کے لیے قوم کی تائید اور سیاسی قیادت کی سرپرستی ضروری ہے۔ ملک کی لبرل اور امریکا نواز لابی نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر شمالی وزیرستان پر لشکرکشی کے لیے مہم چلادی اور پی پی پی اور اے این پی کی قیادت نے کبھی ہلکے سُروں میں اور کبھی اُونچی آواز سے اسی لَے میں لَے ملانا شروع کردی۔ اب یہ بھی ایک معما ہے کہ عین اس ماحول میں سوات کی ایک معصوم بچی پر اور اس کی دو سہیلیوں پر حملہ ہوتا ہے اور حسبِ سابق پاکستانی طالبان نے اس کی نہ صرف ذمہ داری بھی قبول کرلی بلکہ اس کا جواز بھی بڑھ چڑھ کر پیش کردیا۔

پاکستان کی دینی اور سیاسی قیادت نے بجاطور پر اس ظالمانہ حملے کی بھرپور مذمت کی اور پوری قوم نے یک زبان ہوکر اس خلافِ اسلام اور خلافِ انسانیت کارروائی کا ارتکاب کرنے والوں کو قانون کے مطابق قرارِ واقعی سزا کے دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس معصوم بچی کا نام استعمال کرکے شمالی وزیرستان میں فوج کشی کے لیے ایک دوسرا ہی نقشۂ جنگ تیار کرلیا گیا۔ امریکی قیادت، ناٹو کے جرنیل اور سیاست دان، عالمی میڈیا، خود پاکستان کی پی پی اور اس کے اتحادیوں کی قیادت اور لبرل امریکی لابی سب نے یک زبان ہوکر اس مطالبے کی تائید کی اور وزیرداخلہ نے صاف لفظوں میں فوجی آپریشن کا بھاشن دے ڈالا۔ اس بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ

محض اتفاق تھا یا کسی سازش کا حصّہ، یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک معصوم لڑکی کے ساتھ اس ظلم کو، اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے ایک کاری وار کیا گیا لیکن اللہ کی مشیت کا اپنا نظام ہے۔ قوم کے باشعور افراد، خصوصیّت سے دینی قیادت، بالغ نظر صحافی اور کئی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے اس کھیل کا بروقت توڑ کیا۔ غلط کو غلط کہا اور پوری قوت سے کہا، مگر اس ظالمانہ اقدام کی آڑ میں، ملک کو ایک نئی جنگ کے جہنّم میں دھکیلنے کے جس خطرناک کھیل کا آغاز ہونے والا تھا، اسے ناکام بنا دیا اور وہی وزیر داخلہ جو تلوار نکال کر حملے کے لیے پَر تول رہے تھے یوٹرن لیتے نظر آئے اور زرداری صاحب بھی قومی اتفاق رائے کے مفقود ہونے کا نوحہ کرنے لگے۔

نئی جنگ میں دھکیلنے کی سازش اور میڈیا کا کردار

پاکستانی اور مغربی میڈیا اور خصوصیّت سے سوشل میڈیا پر اب جو کچھ آگیا ہے، اس نے پورے کھیل کے سارے ہی پہلو کھول کر سامنے رکھ دیے ہیں اور اس خونیں ڈرامے کے تمام ہی کرداروں کے چہروں سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ ہم صرف ریکارڈ کی خاطر تین افراد کی شہادت اور تجزیہ پاکستانی قوم اور اس کے سوچنے سمجھنے والے عناصر کے غوروفکر کے لیے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس صحافی، یعنی سید عرفان اشرف کی شہادت اور اس کے احساسِ ندامت کو پیش کرنا چاہتے ہیں جس نے وہ پہلی دستاویزی فلم (documentary) بنائی جس میں ۱۱سال کی معصوم بچی کے جذبات محض تعلیم سے اس کی محبت کے تذکرے کی خاطر ریکارڈ کیے گئے تھے اور پھر اس سے کیا کیا گل کھلائے گئے اس پر خود اس کا کیا احساس ہے۔ سید عرفان اشرف اس وقت امریکا کی ساؤتھ اِلی نوئس (Illinois) یونی ورسٹی (بمقام کاربون ڈیل) سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور ان کا مضمون Predatory Politics and Malala ڈان، کراچی میں شائع ہوا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک معصوم سے تعلیمی منصوبے کے ذریعے سیاست کاری کے کیا کیا گل کھلائے گئے اور میڈیا اور میڈیا کی ڈور ہلانے والے سیاسی شاطر کیا کیا کھیل کھیلتے ہیں:

> پھر دوبارہ مشق ہم سب کے لیے تہلکہ آمیز تھی۔ پس اس نے مجھے صحافیانہ اخلاقیات سے بھی اندھا کر دیا اور اپنے دوست ضیاء الدین کی حفاظت سے بھی۔ مجھے یہ احساس ایک بار بھی نہ ہوا کہ اس صورت حال میں نوعمر ملالہ کے لیے خطرہ ہے۔ یہ جزوی بات

تھی اس لیے کہ دستاویزی فلم تعلیم سے متعلّق تھی اور فلم کے مختلف حصوں کی وڈیو بنانا روز کا معمول تھا۔ مجھے مسئلے کی نوعیت کی شدت کا احساس اس وقت ہوا جب نیو یارک ٹائمز نے Class Dismissed کے نام سے ایک مختصر دستاویزی فلم جاری کی۔ آدم بی ایلک اور میری مشترکہ پیش کش پر مبنی اس فلم نے جو ضیاء الدین کے گھر اور اسکول میں بنائی گئی اور جس میں ملالہ مرکزی کردار تھی، غیرملکی ناظرین کو بہت متاثر کیا۔ اسی وقت سے اس خوف نے مجھے گھیر لیا کہ اس طرح ملالہ ایک دہشت ناک دشمن کے سامنے expose ہوگئی ہے۔ جب میں اسے ٹیلی ویژن پر دیکھتا تھا تو یہ خوف احساسِ جرم میں بدل جاتا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو اس قسم کے منصوبوں سے الگ کرلیا۔ پھر میڈیا نے اگلے تین برس میں ملالہ کی تعلیم کی حمایت کو تحریک طالبان پاکستان (TTP) کے خلاف ایک بھرپور مہم میں بدلنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ سیاست دان ملالہ کی جواں توانائیوں کو استعمال کرنے میں میڈیا کی مدد کے لیے اس جھگڑے میں کود پڑے۔ TTP مخالف ایک مضبوط ڈھانچا اس کے نازک کاندھوں پر کھڑا کر دیا گیا۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ یہ میڈیا کے کردار کے بارے میں تشویش کا باعث ہے کہ یہ نوجوانوں کو کس طرح ایک گندی جنگ میں گھسیٹ لاتا ہے جو معصوم لوگوں کے لیے ہولناک نتائج کا باعث ہے۔ لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ گذشتہ عشرے میں اگر عوام کی بڑھتی ہوئی وابستگی نے ایک طرف سیاست دانوں کو اپنی بڑی بڑی ناکامیوں کو چھپانے کے لیے سموک سکرین مہیا کی ہے، تو دوسری طرف ان قربانیوں نے سیکورٹی فورسز کو ایک مشکل دشمن کے ساتھ آنکھ مچولی جاری رکھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

ایک مسئلے سے دوسرے مسئلے تک میڈیا کے ذریعے مبالغے کے ساتھ مسائل کو بڑھایا جاتا ہے، جب کہ لوگ مذمت کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس ظالمانہ سیاست سے حقیقت مجروح ہوجاتی ہے اور خیبرپختونخوا اور قبائلی علاقہ جات میں عسکریت کو فروغ ملتا ہے۔ سیکورٹی آپریشن واضح طور پر مؤثر ہوتے ہیں اور ورکنگ فارمولا مسلح دستوں کو یہ موقع فراہم

کرتا ہے کہ اُس علاقے کے ۹۰ فی صد حصّے پر کنٹرول حاصل کرلیں اور بقیہ عسکریت پسندوں کے لیے چھوڑ دیں۔ معاملات کی یہ گنجلک کیفیت، برسرِ اقتدار اشرافیہ کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ تنازعے کو طول دے سکیں، لیکن وہ عسکریت کو شکست نہیں دے سکتے۔ مرکزی رَو کی سیاسی جماعتیں یہ برداشت نہیں کرسکتیں کہ وہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے منظر پر اُبھر کر سامنے آئیں اور دہشت گردی کے مقابلے کے لیے واضح پالیسی کا اعلان کریں۔ پس اب دیکھنا یہ ہے کہ اس جنگ میں کون جیتے گا؟ کیا اس تنازعے کو ایندھن فراہم کرنے کے لیے مزید شہریوں کے خون کی ضرورت ہے؟ (ڈان، کراچی، ۲۱/اکتوبر ۲۰۱۲ء)

اس دل خراش داستان کا ایک پہلو یہ ہے۔ ایک دوسرا پہلو بھی غورطلب ہے جسے خاصی تفصیل کے ساتھ ڈیولنڈوف (Dave Lindorff) نے کاؤنٹر پنچ کی ۱۸/اکتوبر ۲۰۱۲ء کی اشاعت میں پیش کیا اور جو عالمی طاقتوں اور اربابِ سیاست کے دوغلے پن (duplicity) اور بےضمیری (hypocracy) کا آئینہ دار ہے:

افغانستان اور پاکستان میں پچھلے ہفتے چھے بچوں پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ تین نوبالغ (teenage) لڑکیاں پاکستان میں جن میں سے ایک ملالہ یوسف زئی شدید زخمی ہوئی۔ دوسرا حملہ افغانستان کے ہلمند صوبہ کی تحصیل ناوا میں جس میں امریکی ہوائی جہاز کے حملے میں تین بچے ہلاک ہوئے: ۱۲ سالہ بارجان، ۱۰ سالہ سردار ولی اور ۸ سالہ خان بی بی۔ تینوں ایک ہی خاندان کے چراغ تھے جو اپنے گھر کے لیے ایندھن کے لیے گوبر جمع کر رہے تھے۔ تین پاکستانی بچوں پر حملہ طالبان نے کیا (گو، وہ بچ گئیں) اور افغانستان میں تین معصوم بچوں پر حملہ امریکا کی فوج نے کیا جسے اپنے ٹھیک ٹھیک نشانے (precision attack) پر ناز ہے اور تینوں جان کی بازی ہار گئے۔

اس دوسری تفصیل سے کئی سوالات فوری طور پر اُبھرتے ہیں: سب سے پہلے، یہ اگر تین بچے اس قدر قریب تھے کہ وہ اس 'تیر بہ ہدف' حملے سے مارے جاتے تو پھر یقینی طور پر وہ اتنے قریب بھی تھے کہ طالبان مجاہدین کی کارروائی کی نگرانی کرنے والے جہاز کو بھی

نظر آجاتے اور اُس فضائی حملے کی ضرورت ہی نہ پڑتی جس کا بندوبست کیا گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ امریکا الزامی طور پر کوشش کر رہا ہے کہ شہریوں کی جان کے اِتلاف کو کم کرے۔ اب فرض کر لیجیے کہ فضائی حملے متقابل فوجوں کی جھڑپ (rules of engagement) کے قانون کے مطابق کیے جارہے ہیں، تب بھی حملوں کی اجازت اُس وقت ہوتی ہے جب' امریکا یا اتحادی افواج کے لیے خطرہ منڈلا رہا ہو۔

LED کی تنصیب کس طرح منڈلاتا ہوا خطرہ بن گئی؟ اگر حقیقی مقام معلوم ہو، اُس علاقے کے فوجی دستوں کو خبردار کیا جاسکتا ہے۔ LED ہٹایا بھی جاسکتا ہے اور اُڑایا بھی جاسکتا ہے۔ شناخت کردہ LED منڈلاتا ہوا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ امریکی ذرائع ابلاغ، تین پاکستانی لڑکیوں اور حوصلہ مند لڑکیوں کی تعلیم کے باب میں وکیل ملالہ پر حملے کی کوریج کرتے ہوئے لبریز دکھائی دیتے ہیں۔ تین افغان بچوں کی موت پر یہ سب کچھ نہیں ہوا، تاہم نیویارک ٹائمز نے ایک نام نہاد حملے میں مقبوضہ افغان اتحادیوں کے ہاتھوں ہلاکت پر امریکی فوجیوں کی 'سبز پر نیلی اموات'☆ نامی مضمون کے اختتام کے نزدیک چند پیراگراف لگادیے۔

پاکستان اور امریکا، دو ایسے ممالک ہیں کہ جہاں بچوں پر ہونے والے دو حملوں کا ردعمل انتہائی واضح طور پر مختلف ہے۔ ملالہ اور اُس کی دو ہم جماعت ساتھیوں پر حملے کے بعد پاکستان میں ہزاروں پاکستانی سڑکوں پر نکل آئے تاکہ طالبان جنونیوں کے اقدام پر احتجاج ریکارڈ کراسکیں اور اُن کی گرفتاری اور اُن کو سزا دینے کا مطالبہ کرسکیں (جرم میں معاونت کرنے والے دو ملزموں کو گرفتار کیا جاچکا ہے)۔ حکومتِ پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ قرار پانے والے قاتلوں کو سزا دی جائے گی۔ نیز ملالہ کی برطانیہ میں ایک بہتر

☆ یہ خاص اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ امریکی اور ناٹو افواج پر، جن کا فوجی لباس نیلا ہے، افغان سرکاری افواج، جن کا لباس ہریالی کی مانند ہے، نے حملہ کیا۔ ناٹو اور امریکیوں پر ان افغان حملوں سے مغربی دنیا سخت خفت، بوکھلاہٹ، غصہ کا شکار اور انتقام کے جذبات سے پاگل ہوئی جارہی ہے۔ صرف سالِ رواں میں ایسے حملوں میں ۵۱ امریکی اور ناٹو فوجی ہلاک ہوچکے ہیں، اور انتقاماً ناٹو نے افغان فوجوں کی تربیت کے پروگرام کو معطل کردیا ہے۔

اور محفوظ ہسپتال میں منتقلی کے اخراجات بھی برداشت کیے ہیں۔ دوسری دولڑکیوں کے تحفظ کے لیے بھی مسلح گارڈ فراہم کردیے گئے ہیں۔

اسی اثنا میں، امریکا میں بہت سے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ اُن کی اپنی ملٹری نے تین افغان بچوں کو بھون کر رکھ دیا ہے۔ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ اگر اُنھیں اس کا علم ہو بھی جاتا، تب بھی وہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ سڑکوں پر ایسے بھرپور مظاہرے نہ ہوتے جن میں مطالبہ کیا جاتا کہ فضائی حملے بند کیے جائیں اور ڈرون حملے کے ذریعے قتل کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ صرف ۲۸ فی صد امریکی کہتے ہیں کہ اُنھیں ڈرون کے ذریعے حملے جاری رکھنے پر اعتراض ہے۔ اگرچہ یہ واضح ہے کہ ڈرون حملے سیکڑوں ــــــ شاید ہزاروں معصوم شہریوں کی ہلاکت کا باعث بن رہے ہیں۔

پاکستان میں اسکول کی لڑکیوں پر حملہ کرنے والوں کو پہلے ہی گرفتار کیا جاچکا ہے۔ یقینی طور پر اُن کو مکروہ جرم کی پاداش میں قید کی سزا ملے گی، یہ سلوک اُس پائلٹ اور حملہ کرنے والے افراد کے ساتھ نہ کیا جائے گا جنھوں نے اس ہلاکت خیز حملے میں حصّہ لیا جس کے باعث تین افغان بچے زندگی سے محروم ہوگئے۔

واپسی پر اُن کا خیرمقدم، اُن سے ملنے والے جنگ سے واپس آنے والے 'ہیرو' کے طور پر کریں گے۔ لوگ اُن کے قریب سے گزریں گے اور کہیں گے: ''آپ کی خدمات پر آپ کا شکریہ''۔ چاہے اُس خدمت میں معصوم بچوں کو ہلاک کرنے کی 'خدمت' بھی شامل ہو۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ جن تین بچوں کو نشانہ بنا کر امریکی فوجیوں نے ہلاک کرنے کا جو اقدام کیا ہے وہ افغان حکومت کے ساتھ، قوت کے استعمال کے جن اصولوں پر اُنھوں نے اتفاق کر رکھا ہے، اُس کی بھی خلاف ورزی نہیں ہے؟ اگرچہ ٹائمز نے جو شہ سرخی لگائی ہے اُس کا عنوان ہے: ''اتحادیوں کے حملے میں افغان بچوں کی ہلاکت پر سوالات اُٹھائے گئے''، لیکن اس سوال کا ذکر کہیں نہیں ملتا؟ نہ ٹائمز نے ہی ایمان داری سے یہ رپورٹ کیا کہ یہ امریکی حملہ تھا، جوابی حملہ نہیں تھا۔ (کاؤنٹر پنچ، ۱۸؍اکتوبر ۲۰۱۲ء)

لیکن بات صرف ان چھے بچوں تک محدود نہیں۔ صرف پاکستان میں ڈرون حملوں سے امریکی یونی ورسٹی کی تحقیق کے مطابق ۳ہزار۳سو سے زیادہ افراد ہلاک کیے جاچکے ہیں جن میں سے صرف ۴۱ کے بارے میں معلومات ہیں کہ ان کا کوئی تعلّق القاعدہ یا طالبان سے تھا۔ ۹۸ فی صد عام شہری تھے جن میں سیکڑوں بچے شہید ہوئے۔ یہی خونیں داستان افغانستان کی ہے، عراق کی ہے، کشمیر کی ہے، فلسطین کی ہے، برما کی ہے___ اور نہ معلوم کہاں کہاں روے زمین پر معصوم انسانوں کا خون اسی طرح بہایا جارہا ہے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا اور قاتل کو قرارواقعی سزا دینے والا کوئی نہیں۔ کیا یہی ہے تہذیب وتمدن کا عروج اور جمہوریت کا فروغ؟

اس سارے گھناؤنے کھیل کو کیا نام دیا جائے؟ پاکستان کے ایک سابق نام ور سفیر اور تجزیہ نگار جناب آصف ایزدی نیوز انٹرنیشنل میں اپنے مضمون Malala and the Terrorist Mindset میں یہ کڑوا سچ بڑے صاف الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

> سینٹ میں ایک تقریر کے دوران وزیراعظم نے اس امر پر زور دیا کہ ملالہ پر حملے کے پیچھے 'کارفرما ذہن' کے ساتھ جنگ کی جائے۔ اُنھیں یہ ضرور جان لینا چاہیے کہ دہشت گردی کے تخلیقی سبب کی تلاش ایک کے بعد دوسری پاکستانی حکومت کی اُن پالیسیوں میں ملے گی جن کی وجہ سے تنخواہوں میں بہت بڑا فرق ہے، بدعنوانی کا چلن ہے اور عام آدمی کو تعلیم اور سماجی واقتصادی ترقی کے عمل میں شرکت کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا۔ جب تک ان مسائل کا حل تلاش نہیں کیا جاتا، اس ذہنی رویے کے، جس کی اُنھوں نے نشان دہی کی ہے، پھلنے پھولنے کا سلسلہ جاری رہے گا اور کسی بھی قسم کا فوجی آپریشن نہ صرف بے نتیجہ بلکہ ضرر رساں ہوگا۔
>
> ملالہ ایک بچہ سپاہی ہے جسے 'دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ' کے پروپیگنڈا محاذ پر غیرمسلح اور تنہا روانہ کردیا گیا۔ اُس کے لیے وہی کردار طے کیا گیا جو طالبان کے ۱۵/ ۱۸ برس کے خودکش بم باروں کا ہوتا ہے، تاہم اُس کے بچ جانے کے امکانات نسبتاً بہتر تھے۔ یہ معجزے سے کم نہیں کہ وہ ابھی تک ہمارے پاس ہے۔
>
> ملالہ اس قدر کم عمر ہے کہ اُس کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ وہ کس کے خلاف کام کررہی ہے

اور اُس کی اپنی ذات کے لیے اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ ملالہ پر جو کچھ گزری ہے اُس کی ذمہ داری مکمل طور پر اُن کے سر ہے جنھوں نے اُس نظریہ پرستی کا تنفرانہ استحصال کیا، صرف اس لیے کہ اس طریقے سے وہ اسٹرے ٹیجک اہداف اور سیاسی مقاصد حاصل کرسکیں۔

ایک طرف، جب کہ ہم دعا گو ہیں کہ وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئے، ہمیں اُن کو یہ اجازت نہ دینی چاہیے کہ وہ اپنے گناہ کو مذمت کے خنک دار بیانات سے چھپائیں یا گولی مارنے کے افسوس ناک واقعے کو، ہمارے ملک میں قتل عام اور تنازعات میں گہرا دھکیلنے کے لیے استعمال کریں۔ (نیوز انٹرنیشنل، ۲۲؍اکتوبر ۲۰۱۲ء)

ملالہ بلاشبہہ ایک مظلوم بچی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سب اس کی صحت یابی اور روشن مستقبل کے لیے دعا گو ہیں لیکن وہ صرف اس لیے مظلوم نہیں کہ اس معصوم بچی پر قاتلانہ حملہ ہوا، بلکہ وہ اس لیے بھی مظلوم ہے کہ اس بچی کو کون کون اور کس کس طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گولی کے نشانے پر لگنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس بچی کو دنیا بھر کے لیے معجزانہ طور پر بچالیا اور یہ بھی اس کا کرم ہے کہ پاکستان کو جس آگ میں دھکیلنے اور پاکستان اور افغان قوم کے ایک بڑے حصّے کو تصادم، منافرت، بدلے اور نہ ختم ہونے والی جنگ کی آگ میں دھکیلنے اور امریکی انتخابات میں اس خونیں کھیل کو ایک شعبدے کے طور پر استعمال کرنے کا جو شیطانی منصوبہ بنایا گیا تھا وہ خاک میں مل گیا۔ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۵۴)

امریکی جنگ سے نکلنے کی حکمت عملی

الحمدللہ! وہ سیاہ بادل جو مطلع پر چھا گئے تھے چھٹ گئے ہیں مگر کیا خطرہ فی الحقیقت ٹل گیا؟ جہاں ہمیں اللہ کی رحمت اور اعانت پر پورا بھروسا ہے، وہیں اس امر کا اِدراک بھی ضروری ہے کہ پاکستان شدید اندرونی و بیرونی خطرات میں گھرا ہوا ہے جن کا اِدراک اور مقابلے کے لیے صحیح حکمت عملی اور مؤثر کارفرمائی ازبس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ہم بہت ہی اختصار کے ساتھ چند گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے بلاشبہہ دہشت گردی ایک جرم ہے، خواہ اس کا ارتکاب افراد کریں، یا گروہ یا حکومتیں۔ دہشت گردی انسانی تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے اور اس کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے اور کامیابی سے افراد اور معاشرے کو اس سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا نیویارک کے ٹریڈ ٹاور اور واشنگٹن کے پینٹا گان پر حملہ دہشت گردی کے اندوہناک واقعات تھے مگر دہشت گردی کا آغاز نہ اس واقعہ سے ہوا اور نہ اس کے نتیجے میں دہشت گردی کی نوعیت میں کوئی جوہری فرق ہی واقع ہوا۔ البتہ امریکا نے اس واقعے کو جنگ کا نام دے کر اور اس کے مقابلے کے لیے قانون، افہام و تفہیم، تعلیم اور اصلاحِ احوال کے لیے سیاسی اور معاشی تدابیر کا مجرب راستہ اختیار کرنے کے بجاے، جنگ اور قوت کے بے محابا استعمال کا حربہ استعمال کیا اور پوری دنیا کو ان ۱۱ برسوں میں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس لیے اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دہشت گردی کو دہشت گردی اور جنگ کو جنگ رکھا جائے اور سیاسی مسائل کے عسکری حل کی جو خون آشام حماقت کی گئی ہے، اس سے جلد از جلد نجات پانے کا راستہ نکالا جائے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ جس طرح دہشت گردی اور جنگ کو خلط ملط کیا گیا ہے اسی طرح دہشت گردی اور تشدد، اور تشدد اور انتہاپسندی اور انتہاپسندی اور جدت کو گڈمڈ کرنا ژولیدہ فکری اور کوتاہ اندیشی کا تباہ کن شاہکار ہے۔ ان میں سے ہر اصطلاح کا اپنا مفہوم ہے اور ہر ایک کا اپنا کردار ہے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں ردعمل دینے (respond) کا اپنا انداز ہے۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس خطرناک مغالطے کا نتیجہ ہے کہ بات ذہنی رویے اور سوچ (mindset) کی کرتے ہیں اور اس کے مقابلے کے لیے اقدام فوج کشی تجویز کرتے ہیں، حالانکہ خیالات کا مقابلہ خیالات سے، نظریات کا نظریات سے، دعوے کا دلیل سے کیا جاتا ہے، ڈنڈے اور گولی سے نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں دہشت گردی کا مقابلہ اس سے بڑی دہشت گردی سے کرنے کی جب بھی کوشش کی گئی ہے، وہ ناکام رہی ہے۔ دل اور دماغ کی جنگ دلیل اور نظریات کے ذریعے جیتی جاتی ہے۔ سیاسی، معاشی اور سماجی بنیادوں پر رُونما ہونے والے تشدد کا مداوا بھی ان اسباب کو

دُور کر کے ہی کیا جاسکتا ہے، جو لوگوں کے اختلافات اور شکایات کو تصادم اور تشدد کی طرف لے جانے کا باعث ہوتے ہیں۔ امریکا کے محکمۂ دفاع کا ایک ہمدرد تھنک ٹینک رینڈ کارپوریشن ہے جس نے اس موضوع پر اپنی تحقیق کے نتائج میں نمایاں طور پر یہ بات کہی ہے کہ دہشت گردی کا حل قوت کا استعمال نہیں، بلکہ افہام و تفہیم اور سیاسی معاملہ بندی کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ مائیکل شینک لندن کے اخبار دی گارڈین (۲۵ جولائی ۲۰۱۲ء) میں اپنے مضمون بعنوان The Costly Errors of American Wars میں لکھتا ہے:

> ہماری جنگیں اس قدر مہنگی کیوں ہوچکی ہیں؟ امریکی وزارتِ دفاع سے قربت رکھنے والی رینڈ کارپوریشن کی رائے ہے کہ ۸۴ فی صد دہشت گرد تنظیموں کو ختم کرنے یا بے دست و پا کرنے میں پولیس، سراغ رسانی اور مذاکرات انتہائی اہم اسٹرے ٹیجک اقدامات کررہے ہیں، جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خطیر وسائل، بھاری فوجی اور فضائی لاؤلشکر کی قدر کررہے ہیں، بشمول ۴۰، ۴۰۰؍ارب ڈالر والی مشترکہ حملہ کرنے والی مہنگی آنٹرمز۔ یہ اسٹرے ٹیجک ہتھیار تیزی سے حرکت کرنے والے اور جگہ جگہ پائے جانے والے گروہوں کے مقابلے میں غیر مؤثر ہیں۔ اس قدر انحصار کیوں؟ چونکہ دفاعی صنعت نے ہر ریاست میں اور کم و بیش کانگریس کے ہر ڈسٹرکٹ میں ایسے آپریشن شروع کیے ہیں اور چونکہ اُس کی لابی واشنگٹن میں انتہائی طاقت ور ہے۔ رینڈ نے جو تجویز کیا ہے ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے اور بہت کم اخراجات میں کئی اور ممالک میں صلاحیت پروان چڑھانا چاہیے۔

امریکی افواج کے ادارے رائل یونائیٹڈ اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ طالبان کے ساتھ مذاکرات اور مستقبل کے بارے میں کوئی افہام و تفہیم (understanding) ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ طالبان میں گفت وشنید کے راستے کو اختیار کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ اسی طرح شریعت کی تعبیر، تعلیم اور خصوصیت سے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں وہ اتنے کٹر اور انتہا پسند نہیں جتنا کہ ہمیں خطرہ ہے۔ اور پھر اس رپورٹ میں صاف الفاظ میں عسکری راستے کی جگہ سیاسی راستے کے امکانات کا ذکر کیا گیا ہے:

مذاکرات کے ذریعے اُن غلط فہمیوں کو ختم کیا جاسکتا ہے جن کی وجہ سے تنازعے نے آگ پکڑ لی ہے۔ جیسا کہ شورشوں (insurgencies) سے نجات کے کئی اور واقعات میں ہوا۔ مذاکرات اور بات چیت کے ذریعے تشدد کی شدت اور ہونے والے واقعات کی تعداد میں کمی لائی جاسکتی ہے۔ بصورتِ دیگر تشدد میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ چونکہ طالبان اور طاقت رکھنے والے دیگر گروہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ناٹو کی ہنگامی روانگی کے بعد خلا کو بھریں، افغان نیشنل سیکورٹی فورسز کی جو خامیاں ہیں اُن کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں توقع رکھنا چاہیے کہ طالبان کا دیہی شہری جنوب، جنوب مشرق اور مغرب میں کنٹرول بڑھ جائے گا۔ اس تمام سے واضح ہوجاتا ہے کہ رائے عامہ کے سروے اور تحقیق کیوں ظاہر کرتے ہیں کہ افغانوں کی غالب اکثریت چاہے مرد ہوں یا عورتیں، مذاکرات کی حمایت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اہمیّت اس چیز کو دی جائے کہ کسی بھی شرط کے بغیر کثیر جماعتی ٹھوس بنیاد رکھنے والے کھلے مذاکرات کا اہتمام کیا جائے۔ جس رفتار سے فوجی دستوں اور امداد میں کمی آرہی ہے۔ اسی رفتار سے عالمی برادری کی مختلف جماعتوں پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت، امن کے عمل کے قیام اور ۲۰۰۱ء کے بعد حاصل ہونے والے فوائد سمیٹنے میں واقع ہورہی ہے۔ متفقہ مصالحت کاروں اور ثالثوں کی موجودگی، مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ اگرچہ ایسے لوگ اب موجود نہیں ہیں۔ پاکستان کے تعاون کے بغیر کوئی بھی ذریعہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کو مذاکرات میں ایک نشست ملے یا نہ ملے، اس کے افسران کو لازمی طور پر مذاکرات میں شریک رہنا چاہیے۔ جوں جوں مذاکرات قوت حاصل کریں گے اُسی قدر شمالی اور وسطی افغان سیاسی گروہ اِن میں شمولیت اختیار کرتے رہیں گے۔ (ملاحظہ ہو Matt Waldman کا مضمون بعنوان Why It's Time for Talks with the Taliban، دی گارڈین، ۱۰ستمبر۲۰۱۲ء)

امریکی قیادت طاقت کا کتنا ہی استعمال کیوں نہ کرڈالے سیاسی حل کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ حالات کی اصلاح کے لیے پاکستان ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے لیکن وہ کردار شمالی وزیرستان

میں جنگ کے دائرے کو وسیع کرنے سے ادا نہیں ہوسکتا۔ وہ جنگ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے سے ہی ہوسکتا ہے، لیکن دانا اور طاقت کے نشے میں مست نادان میں فرق یہ ہی ہے کہ نادان پہلے حالات کو بگاڑتا ہے اور پھر وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو دانائی کا تقاضا ہے کہ ؎

ہرچہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیِ بسیار

(ترجمہ: جو کچھ دانا کرتا ہے، نادان بھی بالآخر وہی کچھ کرتا ہے، لیکن خرابی بسیار کے بعد)۔

یہی وہ حکمت عملی ہے جو پاکستان کی پارلیمنٹ نے اپنی تین متفقہ قراردادوں میں طے کی ہے اور جس کی تفصیل پارلیمان کی قومی سلامتی کی کمیٹی نے ایک واضح نقشۂ کار کی شکل میں مرتب کی ہے لیکن اکتوبر ۲۰۰۸ء، اپریل ۲۰۰۹ء، مئی ۲۰۱۱ء اور اپریل ۲۰۱۲ء کی ان تمام ہدایات کو عملاً ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا اور امریکا کے اشارۂ چشم و آبرو اور ترغیب وترہیب (carrot & stick) دونوں کے بے محابا استعمال کے نتیجے میں ملک کو دہشت گردی کی آگ میں جھونک دیا گیا اور اسے مزید تباہی کی طرف دھکیلنے کی مہم امریکا، امریکی لابی، اور امریکا کی باج گزار قیادت پوری قوت سے چلا رہی ہے۔

امریکا عراق اور افغانستان میں ناکام رہا ہے۔ عراق کو جلتا ہوا اور تباہ حال چھوڑ کر رخصت ہوگیا ہے اور افغانستان کو تباہ و برباد کر کے اور خود اپنے فوجیوں کی ۲ہزار اور ناٹو کی ۸۰۰ سے زیادہ ہلاکتوں، نیز ان سے ۱۰گنا زیادہ کے شدید مجروح ہونے اور دماغی اور جسمانی امراض اور محرومیوں کا نشانہ بنانے، خود ان دونوں مظلوم ممالک کے ۲لاکھ سے زیادہ افراد کو لقمۂ اجل بنانے، لاکھوں کو بے گھر کرنے اور خود اپنے ۴ہزار ارب ڈالر سے زیادہ پھونک دینے کے باوجود ناکام و نامراد واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا ہے۔ لیکن اس پر بضد ہے کہ مسئلے کا عسکری حل ہی تھوپنے کی کوشش جاری رکھے گا اور پاکستان کو اپنے برادر ہمسایہ ملک اور اس کے باسیوں سے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں اُلجھا کر جائے گا۔ ویسے تو ۲۰۱۴ء میں فوجوں کی واپسی کا اعلان کیا گیا ہے لیکن امریکا کے سیاسی تجزیہ نگار اور تھنک ٹینک یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ انخلا اس سے پہلے کیا جائے۔

نیویارک ٹائمز نے ۱۳؍اکتوبر ۲۰۱۲ء کی اشاعت میں اپنی تاریخ کا طویل ترین اداریہ

لکھا ہے جو ۱۸۵۶ الفاظ پر مشتمل ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ جیتی نہیں جاسکتی، اس لیے جلد واپسی کا راستہ اختیار کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ ۲۰۱۳ء کے آخیر تک امریکی اور ناٹو کی افواج واپس آجائیں۔ ناٹو کے سیکرٹری جنرل فاگ راسموسن (Fog Rasmussen) نے بھی اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ افغانستان سے بیرونی افواج کا انخلا ۲۰۱۴ء سے پہلے ہوجانا چاہیے۔ اسی راے کا اظہار کابل میں برطانیہ کے سفیر نے کیا ہے۔ فرانس نے ۲۰۱۲ء ہی کے اختتام تک اپنی فوجوں کی واپسی کا اعلان کر دیا ہے۔ ان حالات میں اصل ایشو جنگ کو بڑھانا نہیں، اسے سمیٹنا اور ختم کرنا ہے۔ نیویارک ٹائمز کے اداریے کے یہ الفاظ امریکا اور ناٹو کے اس وقت کے ذہن کی پوری عکاسی کرتے ہیں:

> ریاست ہاے متحدہ امریکا کی افواج کے لیے یہ مناسب وقت ہے کہ وہ افغانستان چھوڑ دیں (کیونکہ) امریکا صدر اوباما کے محدود مقاصد کو حاصل نہ کرسکے گا اور جنگ کو طول دینے کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ نقصان بڑھ جائے۔

اس سوچ کو فروغ دینے میں عسکری اہداف میں ناکامی، اور بڑھتی ہوئی معاشی قیمت اور امریکا اور یورپی ممالک کے روزافزوں مالیاتی خساروں کے علاوہ راے عامہ کی تبدیلی اور خود افغان عوام ہی نہیں، ان افغان افواج تک کے ہلاکت خیز حملے ہیں جن کی تربیت امریکی افواج نے کی ہے اور جن کو آیندہ افغانستان کی سیکورٹی کی ذمہ داری کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔

دہشت گردی کا مقابلہ امن اور دستور سے

ان حالات میں شمالی وزیرستان میں فوجی آپریشن کرنا صرف اپنی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اور اس جنگ کو اپنی جنگ کہنا حقائق کا منہ چڑانا اور عوام کے، جن کی ۹۷ فی صد عظیم اکثریت امریکی فوجی کارروائیوں کی مخالف ہے، کے منہ پر طمانچا مارنا ہے۔

اصول اور سیاسی حکمت عملی، دونوں ہی اعتبار سے اس سے بڑا خسارے کا کوئی اور سودا نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کے چیف جسٹس جناب افتخار محمد چودھری نے اس ہفتے 'قیامِ امن بذریعہ قانون' کے موضوع پر ایک نہایت پُرمغز خطبہ دیا ہے جس میں 'دہشت گردی کے نام پر جنگ' کی حکمت عملی کے مقابلے میں انصاف، آئین اور قانون کی بالادستی پر مبنی حکمت عملی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ پارلیمنٹ

نے جو خطوطِ کار طے کیے تھے اور چیف جسٹس نے جن کو اپنے انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اس آگ سے نکلنے اور ملک و قوم کو امن اور خوش حالی کے راستے پر گامزن کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔

ہم جناب چیف جسٹس کے خطاب سے چند اقتباس دینا ضروری سمجھتے ہیں:

> اگر پاکستان آج ایسے حالات کا سامنا کر رہا ہے جن میں امن ایک سہانا خواب لگتا ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ماضی میں کیے گئے گناہوں کی قیمت چکا رہے ہیں۔ یہ ایک ناگوار حقیقت ہے کہ عرصۂ دراز سے ہم نے اپنے آئین کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا جس کا وہ حق دار تھا۔ قانون کی ناتواں حکمرانی نے عسکری نظریات کو جنم دیا۔ جو قومیں آئین کا احترام کرتی اور اسے حقیقی طور پر نافذ کرتی ہیں، وہ چیلنجوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے اور تنازعات کا تصفیہ کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ آئین شکنی اور قانون کی حکمرانی سے انحراف نے ہمیں بھٹکا دیا اور قانون کی حکمرانی کو پاکستان میں نابود کیا۔ یہی وہ اسباب ہیں جنھوں نے تشدد اور لاقانونیت کی فضا قائم کی۔

ان حقائق کی روشنی میں جناب چیف جسٹس نے پارلیمنٹ سے اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے حتمی طور پر عسکری تنظیموں کے بارے میں قانون سازی کرے اور حکومت ضروری اقدام کرے۔ ساتھ ہی انھوں نے صاف الفاظ میں متنبہ کیا ہے کہ عالمی سطح پر پائی جانے والی بدامنی کا اصل سبب بھی ظلم اور بے انصافی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ:

> پیچیدہ اور جڑوں تک پہنچے ہوئے جھگڑوں نے دہشت گردی، ماورائے عدالت قتل، انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی اور دیگر برائیوں کو جنم دیا ہے، جو انتہاپسندی اور بنیاد پرستی کی افزایش کرتے ہوئے عالمی امن کو مسخ کرنے کی وجہ بن رہی ہیں۔ ان تمام مسائل سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قانون، امن اور تہذیب کی اصولی تعلیمات کو بنیاد بناتے ہوئے افراد اور ریاستوں کے درمیان حائل فاصلوں کو کم کیا جائے اور ان مواقع کو تلاش کیا جائے جو عالمی امن کے قیام میں مددگار ہوں۔ قانون کی حکمرانی کے ذریعے امن کا قیام چاہے مقامی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر، تنازعات اور

دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ہمیشہ انتہائی مفید ثابت ہوا ہے۔ میری راے میں تنازعات میں اُلجھے ہوئے لوگوں کے مابین حقیقی امن منصفانہ تصفیے کی بدولت ہی قائم ہوسکتا ہے۔ اور یہ تصفیہ متحارب جماعتوں کے لیے تب ہی قابلِ قبول ہوگا جب انھیں یقین ہو کہ اسے جائز اور قانونی طریقے سے بروے کار لایا جارہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی تصفیہ جس کی پشت پر قانون کی ضمانت نہ ہو، وہ دیرپا نہیں ہوگا اور ایسے منصفانہ تصفیے کے بغیر قیامِ امن ناممکن ہے۔

زمینی حقائق، عالمی حالات اور تاریخی تجربات سب کا حتمی تقاضا ہے کہ پاکستان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ جلد از جلد امریکا کی اس جنگ سے نکلے اور خود امریکا کو دوٹوک انداز میں مشورہ دے کہ جتنی جلد افغانستان سے اپنی اور ناٹو افواج کی واپسی کا اہتمام کرے، یہ جتنا پاکستان اور امریکا کے مفاد میں ہے اتنا ہی افغانستان اور اس پورے علاقے کے لیے بہتر ہے۔ اس کے لیے تمام متعلقہ قوتوں سے مذاکرات کا جلد از جلد آغاز ہونا چاہیے۔ افغانستان میں بیرونی مداخلت کے تمام راستوں کو بند کیا جائے اور افغانستان کی تمام دینی اور سیاسی قوتوں کی باہم مشاورت سے ایک ایسا سیاسی انتظام کیا جائے جسے افغان تسلیم کریں، اور جس کی باگ ڈور بھی انھی کے ہاتھ میں ہو۔ پھر اس کو عملاً نافذ کرنے کا اہتمام بھی کیا جائے۔ پاکستان اس میں ایک شفاف انداز میں شریک ہو اور افغان عوام کی نگاہ میں، امریکا کے مفادات کے نگہبان کی حیثیت سے نہیں، بلکہ پاکستان اور افغانستان دو برادر مسلم ممالک کے مشترک مفادات کا نقیب بنے۔ امن کا راستہ انصاف اور حقوق کے احترام ہی سے مسخر کیا جاسکتا ہے۔

نئے انتخابات: وقت کا تقاضا

آخری بات ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حکومت نے جس طرح جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کو جاری رکھا اور امریکی مفادات کو مشرف سے بھی زیادہ بڑھ کر آگے بڑھایا، اس سے اسے نہ ملک میں ساکھ (credibility) حاصل ہے اور نہ افغان عوام اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں جلد از جلد نئے انتخابات نہایت شفاف انداز میں منعقد کیے جائیں تاکہ عوام ایک نئی قابلِ اعتماد اور بالغ نظر قیادت کو برسرِ اقتدار لاسکیں جو امریکا سے بھی

باعزت دوستی کا راستہ اختیار کرے، ملک کی معیشت کو عوام دوستی اور خدمت خلق کی بنیادوں پر استوار کرے، اور افغانستان کے مسئلے کا بھی افہام وتفہیم کے ذریعے مناسب سیاسی حل نکالنے کی کوشش کرے۔ ایک حقیقی آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرے جسے پوری قوم کی تائید حاصل ہو۔ اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہوگی کہ سینیٹ کی کمیٹی براے دفاع کے ایک اجلاس میں ڈیفنس سیکرٹری جناب لیفٹیننٹ جنرل (ر) آصف یٰسین ملک نے پہلی بار کھل کر اعتراف کیا ہے کہ پرویز مشرف کی اجازت سے ۲۰ راگست ۲۰۰۱ء سے شمسی ایئربیس امریکا کے زیر استعمال تھا اور وہ وہاں سے پاکستان کی سرزمین پر ڈرون حملے کرتا رہا۔ اس ایئربیس سے یہ سلسلہ ۱۱دسمبر ۲۰۱۱ء کو ختم ہوا۔ واضح رہے کہ اس شرمناک دور میں موجودہ حکومت کے پورے چار سال بھی شامل ہیں۔ جنرل صاحب نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ: the attacks were carried out with the governments approval. (ڈان، ۲۲اکتوبر ۲۰۱۲ء)

فوجی اور سیاسی قیادت دونوں اس پورے عرصے میں امریکی ڈرون حملوں میں پاکستانی حکومت کی شراکت اور اجازت کا انکار کرتے رہے اور قومی سلامتی کی پارلیمانی کمیٹی کے متعدد اجلاسوں میں، جن میں راقم الحروف شریک تھا، ہرسطح کے ذمہ داروں نے پاکستان کی شراکت داری سے برملا انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ حکومت کی اجازت اور تائید ان حملوں میں شامل نہیں۔ لیکن اب اس کا اعتراف کیا جارہا ہے، جو قوم اور پارلیمنٹ سے دھوکا اور ایک قومی جرم ہے جس کا پارلیمنٹ اور عدالت کو قرار واقعی نوٹس لینا چاہیے۔ لیکن ان سب حالات کا واحد حل یہی ہے کہ ملک میں جلد از جلد نئے منصفانہ انتخابات کا اہتمام کیا جائے تاکہ عوام ان لوگوں سے نجات پاسکیں جنھوں نے قوم کو امریکا کی غلامی میں دے دیا اور امریکا کی جنگ میں نہ صرف شرکت کی بلکہ خود اپنی قوم کے خلاف فوج کشی کی اور امریکا کو خود ہماری اپنی سرزمین سے ہم پر ہی گولہ باری کا موقع دیا اور اس کی سرپرستی کی۔

قوم اور دستور سے غداری اور کس چیز کا نام ہے!

فرمایا ہمارے پیارے، ہمارے خیر خواہ، ہمیں کمروں سے پکڑ پکڑ کر جہنّم کی آگ میں گرنے سے بچانے والے، ہرطرح کی تکلیفیں اُٹھا اُٹھاکر ہم تک راہِ ہدایت پہنچانے والے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے:

میری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی اور جب آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اُٹھا، تو کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑے پتنگوں کو روک رہا ہے، لیکن پتنگے ہیں کہ اس کوشش کو ناکام بنائے دیتے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں۔ (اسی طرح) میں تمھیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو۔ (مشکوٰۃ)

دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے اذان کا مکمل جواب دیا___ موذن نے کہا: لا الٰہ الا اللّٰہ تو اس سننے والے نے بھی یہی کہا: لا الٰہ الا اللّٰہ اور اسی طرح اوّل تا آخر (حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح سن کر لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ) تو اس کے لیے اللہ نے جنت لکھ دی۔

بظاہر جنت کا حصول بڑا آسان نظر آتا ہے لیکن یہ وہی پائے گا جس کے دل میں ایمان راسخ ہو، جو دین کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے، جس کی زندگی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے عبارت ہو۔ اذان سن کر آپ عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت کا اقرار تازہ کرتے ہیں اور اس دین کو فلاح ونجات کا ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔

پھر ایسا کیوں ہے کہ ہم اذانیں سن کر بیٹھے رہتے ہیں، نماز بھی نہیں پڑھتے، مسجد نہیں جاتے، جاتے ہیں تو آخری وقت جاتے ہیں، تکبیرتحریمہ کے فوت ہونے کی پروا نہیں کرتے، رکعتیں ضائع کرتے ہیں۔

کبھی آپ نے سوچا: اذان توجہ سے، مکمل سنیں، جواب شعور کے ساتھ دیں، فوراً تیاری کریں، مسجد پہنچیں، نماز کامل استحضار کے ساتھ ادا کریں، اللّٰہ تعالٰی آپ کو جہنم کی آگ سے آزادی کیوں نہیں دے گا۔

دعوتی پیغام: اقبال چودھری، جبیل

سیاسی تبدیلی اور معاشرتی انقلاب

چند قابل غور پہلو

ڈاکٹر انیس احمد

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور اُن لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں ___ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں ___ اور وہ اس آزمایش کے ذریعے سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے! مگر یہ اُس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمھارے سامنے آ گئی اور تم نے اُسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔ محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، اُن سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔

کوئی ذی رُوح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مرسکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثوابِ دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دیں گے، اور جو ثوابِ آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم اُن کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں اُن سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔(آل عمرٰن ۳:۱۳۹-۱۴۶)

سورۂ آل عمران کی سات آیات میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہر دور میں تحریکِ اسلامی کو پیش آنے والے مطالبات، مشکلات، مغالطے اور ان سے نجات حاصل کرنے کی حکمت عملی کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔ حق کے متلاشی جب ایک مرتبہ شعوری طور پر اسلام کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس حق کو انھوں نے پہچان کر حاصل کیا ہے، اب اس کا نفاذ اور اس کی سربلندی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ایک ماہر انجینیر جب سورج کی شعاعوں سے چلنے والی ایک موٹر کار ایجاد کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اپنی سالہا سال کی محنت کو سڑک پر دندناتا ہوا بھی دیکھے۔ وہ اسے محض کاغذ پر یا اپنے کمپیوٹر پر دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ یہی مشکل تحریکی قیادت اور کارکنوں کو درپیش آتی ہے۔

ایک تحریک اگر ۷۰ برس سے حق کی دعوت دے رہی ہو اور اس کے بعد بھی کروڑوں کی آبادی میں اس کا انسانی اثاثہ بمشکل ۵۰ ہزار یا حد سے حد ایک لاکھ افراد ہوں تو اس کا یہ سوچنا معقول نظر آتا ہے۔ جو لوگ باطل، طاغوت اور کفر کی دعوت دیتے ہیں، عصبیتوں کی طرف بلاتے ہیں، ذاتی مالی فائدے کا لالچ دے کر لاکھوں کروڑوں افراد کی حمایت حاصل کر لیتے ہیں وہ دنیا میں کامیاب ہیں۔ ان کے پاس اقتدار ہے، پارلیمنٹ میں اکثریت ہے، عوامی عہدے ہیں۔ ان کا حکم مقامی انتظامیہ پر چل رہا ہے۔ اور جو حق کے متوالے، دن رات اللہ کے دین کی دعوت دینے میں مصروف ہوں ان کے پاس نہ قیمتی گاڑیاں ہوں، نہ ان کے مکانات کئی کئی ایکڑ پر تعمیر ہوئے ہوں، نہ ان کو پارلیمنٹ میں بھاری وزن سمجھا جائے۔

یہ وہ پیش آنے والے مغالطے، مایوس کرنے والے مشاہدات اور غیرمحسوس طور پر قوتِ عمل کو مفلوج کر دینے والے وسوسے ہیں جنھیں طبی زبان میں 'وائرس' کہا جاتا ہے۔ یہ وسوسے غیرمحسوس طور پر تحریکی قیادت ہو یا کارکن، ان کے دل و دماغ میں داخل ہوجاتے ہیں اور پھر انسان کو یہ غم کھانا شروع کر دیتا ہے کہ وہ کس طرح کسی شارٹ کٹ، کسی سیاسی کرتب، جوڑتوڑ، سیاسی نعرے یا اتحاد کے ذریعے ثوابِ دنیا کو حاصل کرلے۔

ایک لمحے کے لیے رُک کر جائزہ لیا جائے تو جو بات آغاز میں فرمائی گئی ہے وہ تحریکی قیادت اور کارکنوں کے لیے چونکا دینے والی بات ہے یعنی تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔ کسی کی وقتی مقبولیت، وسائل پر قابض ہونا، پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرلینا ایسا ہی ہے جیسے بدر کی فتح کے بعد اُحد اور حنین کی آزمایش و امتحان۔ اور اس کا مقصد بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بیان فرمادیا کہ وہ چاہتا ہے کہ اپنے ان مخلص بندوں کو چھانٹ لے جو دعوتِ اسلامی سے بغیر کسی مفاد اور ذاتی شہرت کے وابستہ ہوئے ہیں۔ جن کے لیے کارکن ہونا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ جو نہ عہدوں کی خواہش رکھتے ہیں اور نہ ان کے حصول کے لیے جوڑتوڑ اور منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا: ''تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں''۔ یہ فرمانے کے بعد ایک انتہائی اہم اور کانٹے کی بات یہ فرمائی جارہی ہے کہ اس آزمایش کی گھڑی میں کفر و باطل کے ساتھ مقابلے میں جو اہلِ ایمان شہید ہوئے، دراصل اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی جماعت میں سے کچھ کو یہ اعزاز بخشنا چاہتا تھا___ آج بھی پاکستان ہو یا کوئی اور ملک، تحریک اسلامی کے بعض مخلص کارکن دہشت گردوں کے ہاتھوں ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے شہید ہوتے رہے ہیں___ کہ وہ جس دعوت کو لے کر اُٹھے تھے اس کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا۔

لیکن دوسرا اہم پہلو جس کی طرف صاحبِ تفہیم القرآن متوجہ کرتے ہیں، یہ ہے کہ ''اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور منافقین کے اُس مخلوط گروہ میں سے جس پر تم اس وقت مشتمل ہو، ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو حقیقت میں شہدا علی الناس ہیں، یعنی اس منصب جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے اُمت مسلمہ کو سرفراز کیا ہے''۔ (تفہیم القرآن، ج ا، ص ۲۹۰)

اگر تحریکی کارکنوں کا تعلق قرآن کریم سے قریبی ہوگا تو ہر چوٹ کھانے کے بعد، ہر ظاہری

ناکامی کے بعد ان کے عزمِ شہداعلی الناس میں اضافہ ہوگا اور اگر ان کا زاویۂ نظر بھی یہ ہوجائے کہ وہ کسی طرح عددی قوت کے سہارے اپنے 'ثوابِ دنیا' کو حاصل کرلیں تو پھران پر مایوسی اور پژمردگی کے اثرات ہونے لازمی ہیں۔ مقصد کے حصول میں شبہہ، منزل کے دُور ہونے کا احساس، کوششوں کے باوجود مطلوبہ مقام تک نہ پہنچنے کی حسرت اس نفسیاتی بلکہ وسوساتی کیفیت کے فطری نتائج ہیں۔

پھر یہ بات بیان کی جارہی ہے کہ جس جنت، یعنی اللہ کی رضا کے حصول کے لیے اس دنیا میں جدوجہد کی جارہی ہے وہ محض ۷۰سال کی کوشش سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے تو ۹۰۰ سال کی جدوجہد بھی شاید قلیل ہو۔ لیکن جن اعلیٰ مقام افراد نے ۹۰۰ سال اپنی دعوت کی کامیابی کے لیے جدوجہد کی، ان کا نام آج ان کی استقامت، پُراُمیدی، رب پر اعتماد و بھروسے اور اللہ کی نصرت پر یقین کی بنا پر زندہ ہے۔ اگر مقصود 'ثوابِ آخرت ہے' تو پھر ثوابِ دنیا میں تاخیر بلکہ بعض اوقات اس کا حاصل نہ کرپانا بھی نہ تو ناکامی ہے اور نہ مایوسی کی علت۔

ان آیاتِ مبارکہ کے تناظر میں آج تحریکِ اسلامی کے ہر کارکن، متفق اور ہمدرد کے لیے جو اصل بات سوچنے کی ہے وہ اس کا خود اپنا احتسابی جائزہ لینا ہے کہ کیا وہ شہداعلی الناس کی تعریف میں آتا ہے؟ کیا اس کی پسند، ناپسند، جڑنا اور کٹنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یا اس میں 'ثوابِ دینا' کہیں نہ کہیں داخل ہوگیا ہے، اور غیرمحسوس طور پر وہ بھی معاشرتی مقام (status)، منصب اور سیاسی دوڑ میں آگے نکل جانے کے پُرکشش سراب میں تو گرفتار نہیں ہورہا؟ اپنی ذات کو خود جانچنے کا پیمانہ اُس حدیث صحیح میں بیان کردیا گیا ہے جس کو حضرت ابوامامہؓ نے روایت کیا ہے:

''جس نے اللہ کے لیے دوستی کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روک رکھا، اس نے اپنے ایمان کو مکمل کیا''۔ (بخاری)

وہ بہت سے سوالات جو آئے دن ہمارے ذہنوں میں اُٹھتے رہتے ہیں اور نتیجتاً مایوسی، وسوسے اور مغالطے پیدا کرتے ہیں۔ اگر قرآن کریم میں ان کا جواب تلاش کیا جائے تو اس کتاب و حکمت کی محض دو تین آیات نہ صرف ان کا جواب بلکہ پیش آنے والے مسائل کے حل کی حکمت عملی بھی سمجھا دیتی ہیں۔

قوموں کا عروج و زوال، کسی دعوت کا قبولیتِ عام حاصل ہونا اور لوگوں کا جوق در جوق اس میں شامل ہونا اس کی کامیابی کا تنہا معیار نہیں ہے۔ ایک دعوتِ حق برس ہا برس کے مسلسل عمل کے باوجود محدود تعداد میں افراد کو متاثر کرسکتی ہے اور وہی دعوت بعض اوقات کم وقت میں تیزی سے اثرانداز ہوسکتی ہے۔ نہ ان دو کیفیات میں کوئی تضاد ہے، نہ ایک یا دوسری کیفیت کامیابی یا ناکامی کا حتمی فیصلہ کرسکتی ہے۔

جس پہلو پر ہر لمحے توجہ کی ضرورت ہے وہ دعوت کا مرکزی نکتہ ہے۔ یعنی کیا دعوت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے قیام کی دعوت ہے یا اس میں وہ بہت سے خدا بھی شامل ہوگئے ہیں جنھیں ہم اقتدار، دولت، منفعت، شہرت، تسلیم کیے جانے کی خواہش، نفس کی تسکین وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کام ایک فرد خود ہی کرسکتا ہے لیکن یہی کام تحریکات کو اجتماعی احتساب کی شکل میں کرنا لازمی ہے۔ تحریک کا ہر فیصلہ، اس کی ہر پالیسی ابدی طور پر نہ تو درست ہوسکتی ہے اور نہ غلط۔ ایک حکمت عملی جو آج درست ہو، تبدیلیِ حالات کی بنا پر آیندہ کسی مرحلے میں غلط ہوسکتی ہے۔ وقتی طور پر، مخصوص اہداف کے لیے دیگر قوتوں کے ساتھ اتحاد کو نہیں کہا جاسکتا اور نہ کسی وقتی اتحاد کی بنا پر تحریک کو قیامت تک کسی غلط فیصلے کے لیے موردِ الزام ٹھیرایا جاسکتا ہے، اس لیے تحریکی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان معاملات پر بغیر کسی حجاب کے کھل کر اجتماعی طور پر پالیسی یا حکمت عملی کا احتساب کرے، اور جہاں پالیسی میں کوئی جھول پایا جائے اس کی بروقت اصلاح کی جائے۔ اصلاح کرنا، اللہ کی طرف لوٹنا اور غلطی کا اعتراف کرنا، تحریک کی عظمت کی نشانی ہے۔ فیصلے میں عجلت یا تاخیر انسانی عقل کے محدود ہونے کی بنا پر ایک فطری عمل ہے۔ اس میں کسی فیصلے کے بروقت یا درست ہونے کا اعتراف کرنا اصلاح کی طرف پہلا قدم ہے۔ جس چیز پر کوئی گفتگو نہیں ہوسکتی، وہ قرآن وسنت کا بتایا ہوا مقصدِ حیات ہے۔

تخلیق انسان کے وقت ہی انسان اور فرشتوں کو یہ بات سمجھا دی گئی تھی کہ اسے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو زمین پر نافذ کرنا ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ کے تمام انبیا نے اپنی دعوت کا بنیادی نکتہ قرار دیا، اور خاص طور پر انبیاے کرام کے طریق دعوت اور تبدیلیِ اقتدار کی حکمت کے حوالے سے قرآن کریم جہاں جہاں ہمیں متوجہ کرتا ہے وہ واضح طور پر اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے اپنے جیل کے ساتھیوں سے جو ایک طاغوتی ملوکیت پر مبنی نظام کے تحت جیل میں آپ کے ہمراہ اپنی مدت گزار رہے تھے یہی سوال تو کیا تھا کہ کیا بہت سے خدا بہتر ہیں یا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک۔ آج کے تناظر میں یہی سوال اگر کیا جاتا تو یوں کیا جاتا کہ کیا سیاست کا خدا مغربی لادینی جمہوریت کو ہونا چاہیے؟ اور معیشت کا خدا استحصالی سودی نظام، اور ہر لمحے غربت میں اضافہ کرنے والی تجارتی سرگرمی کو ہونا چاہیے؟ کیا ثقافت کا خدا ہندووانہ اور مغربی تہذیب میں پائی جانے والی فحاشی، عریانی اور تشدد کو ہونا چاہیے؟ اور کیا معاشرت میں برادری خدا ہے، نسب، ذات اور دولت کی کثرت بنیاد ہے کہ اس کی پرستش کی جائے؟ کیا تعلیم کا خدا مادی منفعت ہے کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہو کہ ایک فرد کس طرح معاشی میدان میں دوسروں سے آگے نکل سکتا ہے، یا مذہب کے شعبے میں خدا رہبانیت کی تعلیم ہے کہ ایک شخص اپنا گھر بار، کاروبار، تعلقات چھوڑ کر جنگل بیابان میں جا کر بیٹھ جائے یا کسی لمبے تبلیغی سفر پر نکل جائے اور اپنے گھر، معاشرے اور ملک کو شیطان کے رحم و کرم پر چھوڑ دے؟ یا اس کی معیشت ہو یا سیاست، معاشرت ہو یا تعلیم، ہر ہر شعبۂ حیات میں وہ صرف اُس بات کو مانے جو خالق انسان نے انسانوں پر اپنے خصوصی رحم و کرم، رحمت و محبت کی بنا پر ہدایت، بُرہان، تذکرہ اور الفرقان کی شکل میں نازل کر دی ہے؟___ اور اس طرح ہر ہر شعبۂ حیات میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، قدرت و اقتدار کو عملاً نافذ کر دیا جائے۔ حضرت یوسفؑ کے قصے میں اسی پہلو کی طرف ہمیں متوجہ کیا گیا اور فرمایا گیا کہ ایمان کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت اور اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو:

> اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف ۱۲:۴۰)، فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقِ زندگی ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ جس بات کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے، کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی اُس حاکمیت کا اقرار جب سے اس کا وجود ہے رضامندی کے ساتھ یا ناپسندیدگی اور مجبوری کے ساتھ اس حاکمیت اور اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحدانیت اور

حاکمیت کی گواہی دے رہی ہے۔ چنانچہ ارحم الراحمین فرماتا ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○ (اٰل عمرٰن ۳:۸۳-۸۵)، اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دینُ اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبیؐ، کہو کہ ''ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، اُن تعلیمات کو بھی مانتے ہیں، جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ پر نازل ہوئی تھیں، اور اُن ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسٰیؑ اور عیسٰیؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان اور مُسلم ہیں۔ اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اُس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

توحید کو عملاً اختیار کرنے کے ساتھ جب تک عملی طور پر اپنے تمام معاملات میں اللہ کے بھیجے ہوئے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر عمل کو اختیار کرنے کی نیت اور کوشش نہ کی جائے ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ قرآن کریم نے دوٹوک انداز میں یہ وضاحت کردی کہ اللہ کی بندگی اور حاکمیت کے ساتھ اللہ کے رسول کی اطاعت اور پیروی اور سنت کو حتمی اور تشریعی سمجھے اور نافذ کیے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء ۴:۵۹)
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

اس اطاعتِ رسولؐ کو نہ صرف مطلوب اور مثبت رویہ قرار دیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سمجھا دی گئی کہ اگر رسولؐ کے فیصلے، ارشاد اور عمل کے بارے میں کسی تردد یا تحفظ کا اظہار کیا گیا تو یہ ایمان کو ضائع کر دینے کے مترادف ہوگا اور ایسا عمل یا تو منافق کا ہوگا یا کافر و فاسق کا۔ فرمایا گیا:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ (النساء ۴:۶۱)، اور جب ان سے کہا جاتا ہے آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسولؐ کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ تمھاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔

ایمان کی اس اوّلین بنیاد کا قریبی تعلّق اُس کیفیت سے ہے جس کی طرف آیت مبارکہ کے آغاز میں اشارہ کیا گیا، یعنی انسان کا اپنی کوششوں کو متوقع طور پر کامیاب نہ دیکھنے کے نتیجے میں دل شکستہ اور غمگین ہو جانا۔ کسی بھی تحریک میں اگر جدوجہد کرتے ہوئے ۷۰ سال نہیں صرف ۱۰ سال ہی گزرے ہوں تو اعلیٰ تربیت یافتہ افراد بھی پکار اُٹھتے ہیں: وہ مدد کب آئے گی جس کا وعدہ کیا گیا تھا؟ متی نصر اللّٰہ؟ اس سوال کے پس منظر میں وہ شیطانی وسوسہ مخفی ہوتا ہے جو دل کو شکستہ اور غمگین کرتا ہے۔ اللہ اور رسولؐ پر پورے ایمان کے دعوے کے ساتھ اعلیٰ ترین تربیت یافتہ ہوں یا عام کارکن، اس سوال کا اُٹھنا حیرت انگیز نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے اس سوال کے اُٹھنے پر نہ قیادت کو اور نہ مجموعی طور پر جماعت کو حیرت ہونی چاہیے۔ ہاں، جو بات ضروری ہے وہ اس زمینی حقیقت کا اقرار کرتے ہوئے اس کا قرآن و سنت میں حل تلاش کرنا ہے۔ قیادت کا فرض ہے کہ وہ اپنے عزم، ولولے اور اعتماد کو کارکنوں کے ساتھ مسلسل تبادلۂ خیال کے ذریعے ان تک منتقل کرے اور کسی لمحے تھکن، سُستی اور مایوسی کو قریب نہ پھٹکنے دے۔ چنانچہ مثبت اور تعمیری طرزِ فکر کے ساتھ مروجہ

طریقوں کا جائزہ اور نئے طریقوں کا استعمال کرنا ہی مسئلے کا حل ہے۔ اندرونی تنقید کا نہ صرف برداشت کرنا بلکہ دعوت دے کر تنقید پر آمادہ کرنا اور پھر بغیر مدافعانہ طرزِعمل کے مشاورت کے ذریعے مسئلے کا حل تلاش کرنا تحریک سے جمود، تھکن اور سُستی کو دُور کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

تحریک میں قیادت اور کارکن کے درمیان اصل رشتہ ایمان اور زندگی کے مقصد کے اشتراک کا ہے۔ یہ محض کوئی انتظامی معاملہ نہیں ہے، نہ یہ حاکم اور محکوم کا سا رشتہ ہے، اس لیے جب تک تحریک کے کارکن اور قیادت ایمان کی یکساں سطح پر نہ ہوں، جمود، سُستی اور رفتارِ کار میں کمی کا حل نہیں ہوسکتا۔ ایمان کے اس مقام تک لانے کے لیے نہ صرف قرآن وسنت سے تعلّق بلکہ نظامِ عبادت کا قیام اور نظامِ عبادت کی روشنی میں معاملات میں شفافیت، امانت، سچائی اور پاسِ عہد پر عمل کیا جانا بنیادی اہمیّت کا حامل ہے۔ اگر فکری اور شعوری طور پر ایمان کا تصور تو ذہن میں ہو لیکن اس کا اثر عبادات میں نہ ہو، اور اگر عبادات کا اہتمام ہو، نماز باجماعت ادا کی جارہی ہو، نوافل کا اہتمام بھی ہو رہا ہو، لیکن مالی معاملات، خاندانی ذمہ داریوں، کاروباری تعلقات میں، حتیٰ کہ غیرتحریکی افراد کے حقوق وفرائض کی ادایگی میں غفلت ہو، اور ان معاملات میں اللہ کی رضا کے ساتھ دیگر مقاصد شامل ہوجائیں تو قیادت اور کارکن میں فاصلہ پیدا ہونا ایک فطری عمل ہوگا، اور حزن اور نااُمیدی کسی نہ کسی حوالے سے تحریک میں داخل ہوجائے گی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت کا وعدہ ذہن سے محو ہوجانے کے بعد یاس ومحرومی اور مستقبل کے دھندلا نے کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔

ایمان، دل شکستگی اور مایوسی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایسے موقع پر بھی جب داعیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے دشمن غار کے دہانے پہنچ جاتے ہیں، غار سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے، اس وقت بھی حوصلہ ہارنے کا کوئی جواز قرآن میں نہیں پایا جاتا۔ ایسی آزمایش کی صورت میں بھی اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ پر ایمان، بھروسا اور اس کی نصرت پر اعتماد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ گویا ایسے حالات میں جب بظاہر کوئی متبادل سیاسی حل (option) نظر نہ آتا ہو، اللہ پر ایمان کا مطلب استقامت کا اختیار کرنا ہے اور بغیر نااُمیدی اور دل شکستگی کے اُمید، عزم اور یقین کے ساتھ راہِ حق پر آگے بڑھتے رہنا ہی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

نااُمیدی، فضا کا گرد آلود ہونا اور منزل کا دھندلا جانا ایمان کے منافی ہے۔ اس لیے جس لمحے بھی تحریک کے کارکنوں کو یہ احساس ہو کہ منزل قریب کیوں نہیں آرہی، اور کتنا انتظار کرنا ہوگا، ظالم و جابر کب تک فرماں روائی کرتے رہیں گے؟ فوری طور پر ایمان کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوگی، اور عزمِ نو کے ساتھ قیادت اور کارکنوں کو رجوع الی اللہ اور اتباعِ رسولؐ سے سہارا لینا ہوگا۔ اسلام نام ہی اُمید اور کامیابی پر یقین کا ہے۔ یہ اپنے آپ کو تمام تصورات کی بندگی سے نکال کر صرف اور صرف رب کریم کی بندگی میں لے آنے کا نام ہے۔

سفر کی طوالت، دوسروں کو بظاہر منزل سے قریب دیکھنا ہر حساس انسان میں یہ سوچ پیدا کرسکتا ہے کہ جو شریکِ سفر نہیں وہ تو منزل پر پہنچتے نظر آرہے ہیں، اور جو آبلہ پا ہونے کے باوجود سنگلاخ وادیوں کے تپتے ہوئے فرش پر چل رہے ہوں، وہ ابھی تک منزل کی طرف رواں دواں ہی ہوں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا نہ اُبھرنا غیر فطری ہوگا۔ اس لیے اس قسم کے سوالات سے پریشان ہونے کے بجاے یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہوگی کہ کیا اس کام کے لیے جو مادی اور انسانی وسائل اور تربیت یافتہ افراد کی جماعت مطلوب ہے، اسے ہم پیدا کرنے میں کامیاب ہوچکے ہیں؟ کیا سمت کا تعیّن درست ہے؟ کیا جن قریبی اہداف کو منزل سمجھ لیا ہے وہی منزل ہیں، یا منزل اور مقصد رب کریم کی رضا ہے اور اقتدار و حکومت محض اس کا ایک ذریعہ ہے۔

ایک اور اہم پیغام جو اس آیت مبارکہ میں تحریکی کارکنوں اور قیادت کے لیے قابلِ غور ہے اس کا تعلّق آزمایش سے ہے۔ یوں تو مسلمان کی تمام زندگی ہی ایک آزمایش و امتحان ہے، دن اور رات کا کون سا لمحہ ہوگا جب مومن کی آزمایش نہ کی جارہی ہو، لیکن تحریکی زندگی میں یہ آزمایش مختلف شکلوں میں سامنے آتی ہے۔ کبھی یہ کثرت کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی قلت کی شکل میں۔ بعض اوقات ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے تعداد کے لحاظ سے اپنا مطلوبہ ہدف بڑی حد تک حاصل کرلیا ہے اور حلقۂ اثر کو وسیع کرلیا ہے، جب کہ اگر وسیع تر منظرنامے میں دیکھا جائے تو شاید آبادی کے صرف چند فی صد تک ہی ہماری بات پہنچی ہوتی ہے۔ کبھی ہم یہ دیکھ کر کہ ۱۸ کروڑ افراد میں سے صرف ایک یا دو فی صد تک بات پہنچی ہے، تو ہم اپنی قوت کو غیر مؤثر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ قرآن کریم جو اصول ہماری ہدایت کے لیے بیان کرتا ہے وہ اس منفی فکر کی تردید کرتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○ (انفال ۸:۶۵-۶۶)

اے نبیؐ! مومنوں کو جنگ پر اُبھارو۔ اگر تم میں سے ۲۰ افراد صابر ہوں تو وہ ۲۰۰ پر غالب رہیں گے اور اگر ۱۰۰ آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری ہوں گے۔ کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے، اچھا اب اللہ نے تمھارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں سے ۱۰۰ آدمی صابر ہوں تو ۲۰۰ پر اور ہزار دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

تعداد کی قلت و کثرت سے زیادہ اہم اور بنیادی چیز صبر و استقامت ہے۔ قلت تعداد سے بے پروا ہو کر جب ایک جماعت شہادتِ حق کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے تو پھر حزن و پریشانی اس کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتے۔ وہ وسائل کی کمی کے باوجود اپنے سے بہت بڑے طاغوت پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی نصرت سے غالب آ کر رہتی ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ تحریکی کارکن چاہے ہلکے ہوں یا بھاری، وہ نتائج سے بے پروا ہو کر وسائل کا انتظار کیے بغیر جو کچھ ان کے پاس ہو اسی کے ساتھ میدان میں نکل کھڑے ہوں:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (التوبہ ۹:۴۱) نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

جب جماعت اہلِ ایمان یہ طرزِ عمل اختیار کرے گی تو پھر فرشتوں کے پرّے کے پرّے ان کی استعانت کے لیے آ شامل ہوں گے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً (البقرہ ۲:۲۴۹) بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔

اپنی قوت کو کم تر سمجھنا یا اس پر ناز کرنا، دونوں رویے ایمان کے منافی ہیں۔ یہ طرزِ فکر بھی آزمایش کی ایک شکل ہے۔

وہ آزمایشیں جن سے تحریکاتِ اسلامی ہر دور میں گزری ہیں یکساں طور پر اہمیت رکھتی ہیں جن میں قید و بند اور شہادت شامل ہیں لیکن ان کے علی الرغم آزمایش کی اور بہت سی شکلیں ہیں جن کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر بڑی اور چھوٹی آزمایش میں تحریکی قیادت اور کارکن کا وظیفہ حسبی اللہ، علیہ توکلت، ونعم الوکیل ہو کیونکہ نعم المولیٰ اور نعم الوکیل سے بڑھ کر اور کوئی سہارا اور وسیلہ نہیں ہوسکتا۔ تحریکات کی عمر میں ۴۰ سال تو صحیح طور پر بلوغت تک پہنچنے ہی میں لگ جاتے ہیں۔ اگر کوئی تحریک اس سے قبل بالغ ہوجائے تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہے۔

ایمان کے تقاضوں میں استقامت کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم ظلم، طغیان، شرک، کفر اور ضلالت کو دُور کرنے کے لیے اللہ کے بندوں کو دعوتِ حق دیتے ہوئے اُن عملی مسائل کے حل کے لیے کہاں تک کوشاں رہے ہیں جن کے بوجھ نے ان کی کمر دہری کردی ہے۔ کیا غربت کے خاتمے کے لیے جو انسان کو شرک پر مجبور کردیتی ہے، کیا پانی کی فراہمی، بجلی کے بحران سے نجات، کیا روزگار کی فراہمی اور عوام کی صحت سے متعلق مسائل میں ہم نے اتنی ہی پیش رفت کی ہے جتنی تنظیمی اجتماعات کی شکل میں کی گئی ہے؟ ایمان کا ایک تقاضا اللہ کے بندوں کی خدمت صرف اللہ کو خوش کرنے کے لیے ہے۔

انسانی مسائل میں فکری اور اعتقادی مسائل کے ساتھ ساتھ معاشی مسائل، وسائل کی غیرعادلانہ تقسیم، صحت، غربت اور تعلیم کے حوالے سے اللہ کے بندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جہاد کیے بغیر ہم مکمل دین پر عمل نہیں کرسکتے۔ اللہ کے حقوق کے ساتھ اللہ کے بندوں کے حقوق کو یکساں اہمیت دینا تحریکِ اسلامی کی ایک ایمانی ضرورت ہے۔

حج اور عمرہ بطورِ ہجرت

ڈاکٹر انیس احمد

دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے مسلمان ہر سال لاکھوں کی تعداد میں دُور دراز سے سفر کرنے کے بعد ملّت کے قلب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا رُخ کرتے ہیں اور حج اور عمرہ کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کا کوئی عالمی میلہ نہیں ہے کہ اولمپک کی طرح سے لوگ تفریح اور سیاحت کی غرض سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور میدانِ عرفات میں جاکر قیام کریں، بلکہ یہ ایک جسمانی، روحانی اور نفسیاتی عبادت ہے جس کے صحیح طور پر ادا کرلینے کے بعد ایک نیا مسلمان اور نیا انسان وجود میں آتا ہے۔ اس شعوری عمل کے نتیجے میں انسان کے قلب و دماغ کے ہر ہر گوشے میں پائی جانے والی کمزوریوں کا تزکیہ ہو جاتا ہے اور جس طرح ایک معصوم بچہ شکمِ مادر سے دنیا میں آتا ہے، ایسے ہی ایک زائر، حج کرنے کے بعد برف کے گالے کی طرح پاک و صاف ہوکر نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اس عمل کو جسم میں خون کی گردش اور قلب سے گزرنے کے بعد خون کی اصلاح و پاکیزگی سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح تمام جسم سے خون کھینچ کر قلب کی طرف جاتا ہے اور قلب سے گزرنے کے بعد تزکیے کے بعد جسم کو توانائی دینے کے لیے پھر گردش میں آجاتا ہے، اسی طرح تمام اہلِ ایمان اپنی کمزوریوں، بھول و نسیان اور خطاؤں کے ساتھ حرم شریف کی طرف جاتے ہیں اور میدانِ عرفات میں اپنی غلطیوں کے اعتراف، عزمِ اصلاح اور عہدِ نو کے ساتھ گھروں کو واپس ہوتے ہیں، تاکہ اُمت مسلمہ ہر سال ایک عملی تطہیر و تزکیے کے ذریعے تازہ قوت، بلند حوصلوں اور قابلِ عمل اصلاحی حکمت عملی سے لیس ہوسکے۔

اگر غور کیا جائے تو حج اور عمرہ اور اسلام کے تصورِ ہجرت میں ایک انتہائی قریبی معنوی ربط

پایا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے مکہ مکرمہ کی آزمایشوں کی بھٹی سے گزرنے کے بعد حبشہ اور مدینہ منورہ ہجرت کی، ان کے مقام کی بلندی اور ان کے خلوص کا اعتراف قرآن و سنت نے تحسینی کلمات کے ساتھ کیا اور انھیں کامیاب اور بامراد قرار دیا۔ حضرت عمرؓ کی مشہور روایت میں نیت کو اعمال کی بنیاد قرار دیتے ہوئے جو مثال سمجھانے کے لیے استعمال فرمائی گئی، وہ ہجرت ہی کی مثال ہے کہ جس نے اللہ کے لیے ہجرت کی وہ کامیاب ہوگیا۔ حج اور عمرہ کا وجوب بھی قرآن کریم کی آیت مبارکہ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرہ ۲:۱۹۶) ''اللہ کی خوش نودی کے لیے جب حج اور عُمرے کی نیت کرو، تو اُسے پورا کرو، اور اگر کہیں گھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کرو''، اور وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (الحج ۲۲:۲۷) ''اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اُونٹوں پر سوار آئیں''، سے بطور ایک عبادت و فریضہ ثابت ہے۔ مشہور حدیث میں اسلام کے ارکان میں حج ایک رکن کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے لیکن سوال یہ اُبھرتا ہے کہ آخر اس کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ ہر سال لاکھوں افراد اپنا مال، وقت، اور محنت صرف کر کے اس فریضے کو انجام دیں۔

● **ہجرت اور تزکیہ**: ہماری نگاہ میں قرنِ اوّل میں اہلِ ایمان نے ہجرت کی۔ فتح مکہ کے بعد جب ہجرت عملاً ختم ہوگئی تو تزکیے کے اس اہم عمل کو باقی رکھنے کے لیے حج کی شکل میں اس کا بندوبست کر دیا گیا کہ قیامت تک ایک مسلمان مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بزرگ، وہ حج اور عمرے کے ذریعے سے ہجرت کے عمل سے گزر سکے۔

پہلی ہجرت ایک مومن اس وقت کرتا ہے جب وہ یہ نیت کرے کہ اسے حج کرنا ہے۔ اس کا نیت کرنا اپنے رُخ اور قبلے کو درست کرنے کے بعد یہ ارادہ کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ایک عبداً شکوراً بنانے کے لیے تیار رہے۔ ہجرت کی جانب اس کا دوسرا قدم اس وقت اُٹھتا ہے جب وہ اُس مال کی طرف دیکھتا ہے جو اُس نے بڑی محنت اور مشقت کے بعد کمایا تھا اور طے کرتا ہے کہ اس مال کو اللہ کی راہ میں صرف اُس کی خوش نودی کے لیے، اس کے گھر کی زیارت کے لیے استعمال کرے۔ یہ خواہش اسے یہ سوچنے پر مجبُور کرتی ہے کہ جس مال کو

وہ اِس غرض کے لیے استعمال کرنے جا رہا ہے، کیا اسے جائز اور حلال طریقے سے حاصل کیا تھا یا غیراخلاقی ذرائع سے۔ مال کا یہ تزکیہ اس کے ایمان اور صرف حلال کمائی کے ذریعے ایک اچھے کام کو کرنے کی تربیت کرتا ہے۔

اس عمل کے دوران تیسری ہجرت کا آغاز اس وقت شروع ہوجاتا ہے جب وہ اپنے اہلِ خانہ، دوستوں، کاروباری شراکت داروں، غرض ہر فرد کی وابستگی سے نکل کر صرف اللہ کے لیے ان سب کو پسِ پشت ڈال کر صرف اللہ کی طرف لپکتا ہے اور زبان اور دل سے کہنا شروع کرتا ہے کہ میں حاضر ہوں، مالک میں حاضر ہوں۔ صرف آپ کی ایک آواز کے جواب میں، سب کچھ پیچھے چھوڑ کر، آپ کے گھر کی طرف رُخ کر رہا ہوں اور یہ اس لیے کر رہا ہوں، کہ آپ اور صرف آپ، سب سے اعلیٰ، بلند، عزیز، حمد کے مستحق اور نعمتوں کے دینے والے ہیں۔

حج و عمرہ کے لیے نکلتے وقت وہ چوتھی ہجرت اس وقت کرتا ہے جب اپنے قومی لباس، اور زبان کو ترک کر کے صرف دو سفید چادروں میں اپنے آپ کو لپیٹ کر سفر پر روانہ ہوتا ہے، اور عملاً اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ انسانی ضروریات کو خود اپنے ہاتھ اور ارادے سے کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق بھی کرتا ہے کہ اس کی اصل پہچان نہ اس کا قومی لباس ہے نہ قومی زبان، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا بندہ بن جانا اسے دنیا کے تمام انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔

پانچویں ہجرت وہ اس وقت کرتا ہے جب اس کی پہلی نظر خانہ کعبہ پر پڑتی ہے اور وہ جذبات سے بے تاب ہوکر طلبِ عفو و درگزر اور شعوری اور غیرشعوری گناہوں کے احساس کے ساتھ ایک سوالی بن کر اس عظمت والے گھر میں قدم رکھتا ہے۔ انسانوں کے اس سمندر میں جو طوفانی ریلے کی طرح اللہ کے گھر میں موجزن نظر آتا ہے، وہ عاجزی اور خاکساری اختیار کرتے ہوئے دوسروں کو تکلیف نہ دینے کی خاصیّت پیدا کرتا ہے۔

چھٹی ہجرت وہ اس وقت کرتا ہے جب وہ مراسمِ حج سے فارغ ہونے کے بعد اس عزمِ نو کے ساتھ اپنے گھر کی طرف لوٹتا ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو تمام غلامیوں سے نکال کر صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی میں دے چکا ہے۔ اس لیے بات وہ کرے گا جو حق ہو۔ کام وہ کرے گا جو حلال ہو، نگاہ وہ ڈالے گا جو پاکیزہ ہو، اور اپنے گھر، معاشرے اور ملک میں صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی

کے مطابق کام کرے گا، اور ان تمام رسومات سے اپنے آپ کو کاٹ لے گا جو اس کی برادری اور دوستوں نے ایجاد کر رکھی ہیں۔

حج اور عمرہ کے ذریعے ہونے والی ہجرت اسے اُس مقام سے قریب تر لے آتی ہے جو اسلام کے دورِ اوّل میں اللہ کے نیک بندوں نے اپنا سب کچھ اپنے رب کے لیے قربان کرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ یہ ہجرت فتح مکہ کے بعد اور قیامت تک اسے موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ کر اُن افراد میں شامل ہو جائے جن کا جینا اور مرنا، جن کی قربانی اور عبادت، جن کی فکر و عمل صرف اور صرف احکم الحاکمین کی مرضی کے تابع ہوتی ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو ہر بندگی پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ ہجرت زندگی میں ایک مرتبہ حج کر لینے اور حسبِ استطاعت ایک سے زائد عمرے کے ذریعے زندگی میں کئی بار بھی کی جاسکتی ہے، لیکن صرف ایک شرط کے ساتھ کہ اس کا مقصد صرف اور صرف اپنے تمام وجود کو اللہ تعالیٰ کی بندگی و اطاعت میں دینا مقصود ہو۔

---

(73) عجز: قیادت کی قدرِ اعلیٰ

احساس ذمہ داری افراد میں عجز پیدا کر دیتا ہے جس سے ذمہ داری کی ادائیگی آسان ہو جاتی ہے۔ عجز کے نتیجے میں احترامِ آدمیت اور احساسِ بندگی کو نشو و نما ملتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر منصب اور اختیار و اقتدار کا نشہ طاری ہو جائے تو کبر اور پندار کا ظہور ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قیادت اور افراد کے درمیان رخنہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تناؤ اور گھٹن میں دونوں کا ساتھ چلنا مشکل ہوتا ہے۔

عجز کا مطلب خود شکستگی، غفلت، بے نیازی، پستی، یا اپنی تذلیل پر راضی ہو جانا نہیں۔ مصنوعی عجز بھی غرور کی ایک قسم ہے۔ عجز اگر فطری ہو تو یہ قیادت کی قدرِ اعلیٰ کے مصداق ہے۔ اس سے اجتماعیت کی اخلاقی قوت مستحکم ہوتی ہے اور کئی محاسن جنم لیتے ہیں۔

قیادت میں عجز کا مفہوم یہ ہے کہ قیادت اپنا تعلق زمین سے، زمینی حقائق سے، افرادِ کار سے اور زمینی معاملات سے قائم رکھے۔ اپنے ہر فیصلے کی پرواز کی ابتدا، انتہا اور اس کا مدار زمین ہی کو سمجھے۔

قیادت کا عجز اجتماعیت میں نکھار پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے چند مظاہر یہ ہیں:

۱- ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر کام کی کوشش کرتا ہے اور ستایش یا صلے کی تمنا کے بغیر کام کو آگے بڑھاتا ہے، خود کو پیچھے رکھتا ہے۔

۲- قائد اپنی صلاحیت، خوبی اور خامی کا صحیح اِدراک رکھتا ہے۔ دوسروں کو اپنی جگہ اہمیّت دیتا ہے۔ وہ کام لیتا ہے اور کام کرتا ہے۔

۳- وہ پہلے سنتا ہے، اس کی گفتگو خاموشی اور سکوت کے وقفوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

۴- وہ اپنی غلطی کے اعتراف میں پہل کرتا ہے، دوسرے پر الزام نہیں ڈالتا۔ اپنے ماتحت کی غلطی کی ذمہ داری خوشی سے لیتا ہے۔

۵- جذبات پر قابو رکھتا ہے۔ غصّے سے گریز کرتا ہے۔ سخت زبان سے پرہیز کرتا ہے۔ خوشی اور دُکھ کی صورت میں صبر کا مظاہرہ کرتا ہے۔ الجھاؤ اور بحث سے دُور رہتا ہے۔

۶- عجز میں دورنگی دُور ہو جاتی ہے۔ عاجز جو کہتا ہے وہ کر دیتا ہے۔ عاجز اپنے شفاف پن میں عزت تلاش کرتا ہے۔

۷- اپنے مفاد، اپنی اَنا، اپنی رائے پر اعتماد رکھتے ہوئے دوسروں کی رائے، ان کی عزت اور ان کے فائدے کو ملحوظ رکھتا ہے۔

۸- عاجز کسی بھی کامیابی کا سہرا دوسرے شریکِ کار کے حصّے میں ڈالتا ہے۔ خود کو پیچھے رکھتا ہے۔

۹- عاجز مدد دیتا ہے، مدد کرواتا ہے۔ اس طرح اس کو خود بخود مدد ملتی ہے۔

۱۰- عاجز دوسروں کے حصّے کا کام خود کرتا ہے۔ اپنا کام کسی اور کے لیے نہیں چھوڑتا ہے۔

اخوان المسلمون، مصر اور احیاے اسلام

ڈاکٹر شائستہ پروین

مصر میں ۳۰ برسوں تک استبداد و آمریت کے بل پر حکومت کرنے والے صدر محمد حسنی مبارک کو آخر کار ۱۸ دنوں کے عوامی مظاہروں کے بعد ۱۱ فروری ۲۰۱۱ء کو استعفا دینا پڑا۔ مغربی میڈیا اور مغرب کے پروردہ عرب اخبارات و رسائل کے اسلام اور اسلامی تحریک کے خلاف زبردست منفی پروپیگنڈے کے باوجود ملک میں ہونے والے تین مراحل میں عوامی انتخابات کا نتیجہ ۲۰۱۲ء میں سامنے آیا، تو معلوم ہوا کہ 'اخوان المسلمون' نے ۴۷ فی صد (۲۳۵) اسمبلی نشستیں اور دوسری بڑی اسلامی جماعت 'النور' نے ۲۵ فی صد (۱۲۵) نشستیں حاصل کیں اور مغرب کے گماشتوں سیکولر رہنماؤں اور پارٹیوں کا صفایا ہوگیا۔ عوامی انتخابات میں اسلام پسندوں کی یہ عظیم الشان فتح ان کی ۸۲ سالہ تعمیری جدوجہد، فلاحی خدمات اور صبر آزما کوششوں کا نتیجہ ہے۔ شاہ فاروق سے لے کر حسنی مبارک تک سب نے اخوان المسلمون پر پابندی عائد کی اور اس کے کارکنوں کو مسلسل قید و بند اور تشدد کا نشانہ بنائے رکھا۔ ان کا جرم کیا ہے؟ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ۔ اور اس سے بڑا گناہ ہے ان کی خدمت خلق کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت اور اللہ پر ایمان و توکل۔

اخوان المسلمون کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب مصر میں وطن پرستی، قوم پرستی اور مغرب پرستی شروع ہوگئی تھی اور روایتی اسلام اور تجدد کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو گیا تھا، جس میں شیخ علی عبدالرازق کی[1] الاسلام واصول الحکم، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی[2] الشعر الجاھلی، قاسم امین[3] کی تحریر المرأة اور المرأة الجدیدة نے خاص رول ادا کیا۔ جس میں سید جمال

الدین افغانی،[۴] مفتی محمد عبدہٗ ،[۵] سید رشید رضا،[۶] مصطفیٰ صادق الرافعی[۷] محمد فرید وجدی[۸] اور محبّ الدین الخطیب[۹] جیسے اسلام پسندوں کی کوششیں بظاہر دب کر رہ گئیں۔

۱- امام حسن البنّا شہید (۱۹۰۶ء-۱۹۴۹ء)

امام حسن البنّا کی قیادت میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء تک اخوان ایک نظریے اور تحریک کی شکل میں ظاہر ہوئے[۱۰] اور پہلا دعوتی مرحلہ انتہائی خاموشی سے عمل میں آیا۔ دوسرا مرحلہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک ہے۔ اس میں اخوان نے سیاسی میدان میں قدم رکھا، سماجی اور اقتصادی پروگراموں میں توسیع کی، ثقافتی اور جسمانی تربیت کا اہتمام کیا اور پورے ملک میں آزادی اور اسلام کا نعرہ بلند کیا۔ نتیجے کے طور پر حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگے اور انگریزوں نے ان کے بڑھتے قدموں کو روکنے کی کوشش کی۔ حکومت پر دباؤ ڈالا اور ہفتہ وار التعارف، الشعاع اور ماہنامہ المنار پر پابندی عائد کردی۔[۱۱] آپ کی قیادت میں تیسرا مرحلہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء پر مشتمل ہے جس میں اخوان نے مصر کی سرحدوں سے نکل کر عالمِ عرب میں اپنی شاخیں قائم کیں۔ ۵ مئی ۱۹۴۶ء کو الاخوان المسلمون کے نام سے تحریک نے پہلا روز نامہ شائع کیا، جس سے استعماری حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ انگریزوں کے مکمل انخلا کا مطالبہ ہوا اور ان سے براہِ راست تصادم ہوا۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو عرب لیگ کے زیر اہتمام فلسطین میں عرب فوجیں اُتریں اور یہودیوں کے خلاف جہاد شروع ہوگیا۔ اخوان نے اس جنگ میں شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ وزیراعظم نقراشی پاشا نے ۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مارشل لا آرڈی ننس نمبر ۶۳ کے ذریعے اخوان کو خلافِ قانون قرار دے کر پورے ملک میں تشدد کا ماحول پیدا کر دیا اور خود ایک نوجوان کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ نئے وزیراعظم عبدالہادی پاشا کے دور میں اخوان کے ہزاروں کارکن گرفتار کر لیے گئے اور امام حسن البنّا کو ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء کو خفیہ پولیس نے شبان المسلمین کے دفتر کے سامنے سر بازار شہید کر دیا۔[۱۲]

۲- حسن بن اسماعیل الھضیبیؒ (۱۸۹۱ء-۱۹۷۲ء)

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اخوان نے ممتاز قانون دان حسن بن اسماعیل الھضیبی کو اپنا دوسرا مرشد عام منتخب کیا۔[۱۳] شیخ ہضیبی نے بحیثیت قائد، حکومتی جبر و تشدد کے ردعمل میں تحریک اسلامی کو جوابی تشدد

سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ قرآن وسنت کے دلائل پیش کیے اور اخوانی نوجوانوں کے ایک انتہا پسند گروہ کی تفہیم کے لیے آپ نے ایک کتاب دعاۃ لا قضاۃ (ہم داعی ہیں، داروغہ نہیں) تصنیف کی، اور تمام آزمایشوں سے گزرنے کے باوجود ملک میں اسلامی اور جمہوری اقدار کی بحالی پر ڈٹے رہے۔ ۲۶/اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈراما اسٹیج کیا گیا، اور اس کا 'الزام' اخوان پر لگاتے ہوئے اس کے کارکن گرفتار کر لیے گئے جن کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچی۔ ۷نومبر ۱۹۵۴ء کو فوجی عدالت نے چھے اخوانی رہنماؤں کو سزاے موت دے دی۔ وہ چھے رہنما یہ تھے: ۱- عبدالقادر عودہ، نائب مرشد عام، ۲-شیخ محمد فرغلی، مکتب الارشاد کے رکن رکین، ۱۹۵۱ء میں معرکۂ سویز میں اخوانی دستوں کے کمانڈر، جن کے سر کی قیمت انگریزی فوج کی ہائی کمان نے ۵ ہزار پونڈ مقرر کی تھی، ۳-یوسف طلعت، شام کی تنظیم کے نگران اعلیٰ، ۴- ابراہیم الطیب، قاہرہ زون کی خفیہ تنظیم کے سربراہ، ۵- ہنداوی دویر ایڈووکیٹ، ۶-عبداللطیف۔

جولائی ۱۹۶۵ء میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کے الزام میں تقریباً ۲۰ ہزار سے ۵۰ ہزار تک اخوان جیلوں میں ڈال دیے گئے جن میں ۷۰۰ سے ۸۸۰ تک خواتین بھی شامل تھیں۔ مرشد عام حسن الہضیبی کو تین سال کی قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ طویل مدت تک قیدوبند کی آزمایش سے رہا ہوئے تو ان کی صحت تیزی سے بگڑتی گئی اور ۱۹۷۲ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ شیخ الہضیبی کی زندگی میں اخوان المسلمون بڑے نازک مراحل سے دوچار ہوئی مگر مرشد عام کی فراست اور ایمانی استقامت نے تنظیم میں لغزش نہ آنے دی۔[14]

۳- سید عمر تلمسانیؒ (۱۹۰۴ء-۱۹۸۶ء)

حسن الہضیبی کے انتقال پُرملال کے بعد اخوان کے باہم غور وخوض کے بعد سید عمر تلمسانی تیسرے مرشد عام مقرر ہوئے۔[15] جمال عبدالناصر کے بعد محمد انور سادات کا دور مصر میں قدرے نرمی کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ انھوں نے ناصری دور کی دہشت گردی اور ظلم وجور کا خاتمہ کیا اور اخوانی رہنماؤں اور دوسرے قیدیوں کو بتدریج جیل خانوں سے رہا کیا۔ سید عمر تلمسانی نے پورے دور میں تعلیمی اور تربیتی امور پر توجہ مرکوز رکھی۔ اسی دور میں الاخوان کی پالیسی سے اختلاف رکھنے والوں نے 'الجماعات الاسلامیہ' کے نام سے تنظیم بنائی۔[16] اس کے رہنما ایک نابینا خطیب اور مبلغ

شیخ عمر عبدالرحمٰن تھے۔ حکومت نے اس کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے اس پر پابندی لگادی اور شیخ عمر عبدالرحمٰن گرفتار کر لیے گئے اور ہزاروں کارکنوں کو بھی گرفتار کرلیا گیا، بالآخر انھیں ملک چھوڑنا پڑا۔ ۱۹۷۹ء میں اسماعیلیہ میں الفکر الاسلامی کے موضوع پر سیمی نار ہوا، اس میں صدر مملکت نے اخوان پر اعتراضات والزامات کی بوچھاڑ کردی، جس کا سید تلمسانی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔[۱۷] ۱۹۸۱ء میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اخوان بلاجواز نشانہ بنے۔ اخوان سے اختلاف رکھنے والے افراد کے ہاتھوں صدر سادات کے قتل کے بعد ملک کی باگ ڈور حسنی مبارک کے ہاتھوں میں آئی۔

۱۹۸۶ء میں مرشد عام کبرسنی اور نقاہت کے باعث جوارِ رحمت الٰہی میں چلے گئے۔

۴-استاذ محمد حامد ابو النصرؒ (۱۹۱۳-۱۹۹۶ء)

۱۹۸۶ء میں استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ کو چوتھے مرشد عام کی ذمہ داری سونپی گئی۔[۱۸] استاد محمد حامد کے ۱۰ سالہ دورِ قیادت میں اخوان نے سیاسی سطح پر غیرمعمولی کامیابی حاصل کی۔ اپریل ۱۹۸۷ء کے پارلیمانی انتخابات میں حصّہ لے کر مصری پارلیمنٹ میں ۳۶ اخوان امیدوار کامیاب ہوکر شامل ہوئے۔ ۱۹۸۹ء کی مجلس شوریٰ کے وسط مدتی اور مقامی انتخابات میں بھی اخوان نے حصّہ لیا۔

۱۹۹۱ء میں اخبار الاھرام کے ایک ذیلی ادارہ سنٹر فار پولیٹیکل اینڈ اسٹرے ٹیجک اسٹڈیز نے مصر کے سیاسی وسماجی حالات پر ایک معروضی تجزیہ پیش کیا۔ اس رپورٹ میں اسلامی قیادت کی مقبولیت اور اخوانی کارکنوں کے عوامی اثرات پر اضطراب کا اظہار کیا گیا تھا۔ ۱۹۹۵ء میں پارلیمانی انتخابات سے قبل ہی صدر حسنی مبارک نے اخوان کے ساتھ پھر داروگیر کا معاملہ کیا، اور بیش تر اخوانی رہنماؤں کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا۔ یہ واقعہ بھی تاریخ کا ایک اہم باب ہے کہ پہلی بار اس کیس میں ملک کے مختلف طبقوں اور تمام احزاب اختلاف سے تعلق رکھنے والے ۳۵۰ وکیلوں نے اخوان کے دفاع کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔[۱۹]

استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ کے دور میں اخوان نے خلیجی ممالک اور عالم اسلام کے مسائل پر بڑا جرأت مندانہ اور معتدل موقف اختیار کیا اور تمام حالات کا سنجیدہ تجزیہ کر کے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ استاذ ابوالنصرؒ کا پہلا بیان کویت پر عراق کے حملے کے دن ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو ہی شائع ہوا، جس میں

عراقی جارحیت کی مذمت اور جان و مال کی تباہی پر اظہار افسوس کیا گیا تھا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۹۱ء کو مرشد عام نے امریکی حملے کے تیسرے دن ایک اور بیان جاری کیا جس میں امریکی حملے اور متحدہ فوجی قوتوں کی مذمت کے ساتھ اس بحران کا ذمہ دار عرب حکام کو قرار دیا۔ تیسرے مرحلے میں عرب حکومتوں سے عوام کو آزادیِ راے اور صحت مند شورائی نظام کے قیام کی درخواست کی۔

چوتھے مرشد عام استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ نے ۱۰ سال اخوان المسلمون کی بھرپور قیادت کر کے ۲۹ شعبان ۱۴۱۶ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء کو عالم آخرت کی راہ لی۔[۲۰]

۵- استاذ مصطفی مشہورؒ (۱۹۲۱ء-۲۰۰۲ء)

استاذ ابوالنصرؒ کی تجہیز و تکفین سے فراغت کے بعد، تمام اخوانی رہنماؤں نے پانچویں مرشد عام کی حیثیت سے استاد مصطفیٰ مشہور کے نام پر اتفاق کرلیا۔[۲۱] استاد مصطفیٰ مشہور ایک ادیب، مصنف، صحافی اور خطیب بھی ہیں۔ ان کی دسیوں کتابیں اور سیکڑوں مقالات شائع ہوچکے ہیں۔ استاد مصطفیٰ کا سب سے اہم فکری کارنامہ قضیۂ تکفیر کا تجزیہ ہے، یعنی اسلام کے انقلابی تصور کو نہ ماننے والوں اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے غفلت کرنے والوں کو کافر یا مشرک قرار دینا۔ اس مسئلے پر اخوان کے دوسرے مرشد حسن اسماعیل ہضیبی نے فقہی اور قانونی پس منظر میں کلام کیا ہے، مگر آپ نے دعوتی اور سماجی تناظر میں دلائل کے ساتھ بات کی ہے جس کے مختصر نکات یہ ہیں:

۱- دوسروں کے ایمان و اسلام کے بارے میں فیصلہ دینا کسی مسلمان پر واجب نہیں ہے۔

۲- ہر مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو محترم ہے۔ اس پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

۳- راہِ حق کی آزمایشیں انسانی غلطیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سنت الٰہی کا حصّہ ہیں۔

۴- کفر کے فتووں سے عام مسلمانوں میں نفرت اور وحشت پیدا ہوتی ہے اور وہ دعوت کے دشمن بن جاتے ہیں۔

فاضل مصنف نے اس فکری انحراف کے اسباب پر مفصل گفتگو کی ہے، جن کا اختصار اس طرح ہے: (الف) سطحی اور سرسری علم (ب) اصول اور فروع میں عدم امتیاز (ج) افراط و تفریط (د) عجلت اور بے صبری (ہ) تربیت کے بجاے سیاسی طریقے پر زور (و) اشخاص اور قائدین پر انحصار۔

آپ کا انتقال ۸ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۴ نومبر ۲۰۰۲ء کو ہوا۔[۲۲]

۶- المستشار محمد مامون الہضیبیؒ (۱۹۲۱ء-۲۰۰۴ء)

استاد مصطفیٰ مشہور کی وفات کے بعد ان کے نائب مرشد عام محمد مامون الہضیبی چھٹے مرشد عام منتخب ہوئے۔[۲۳] اخوان المسلمون کا ابتدائی دور دعوت وتبلیغ کے ساتھ، کش مکش اور جہاد کا دور ہے۔ حسن الہضیبیؒ کا دور ابتلا و آزمایش کا دور ہے۔ شیخ عمر تلمسانیؒ کے دور سے سیاسی نظام میں تبدیلی ہوئی، حتیٰ کہ مصطفیٰ مشہورؒ کے دور میں وہ تبدیلی کا ماڈل بن گیا۔ اس منہج کو فکری اور عملی اور دوسرے محاذوں پر تقویت دینے میں محمد مامون کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ تقریباً ۱۴ مہینے تک مرشد عام کی ذمہ داری نبھانے کے بعد محمد مامون الہضیبی جمعۃ المبارک ۹ جنوری ۲۰۰۴ء میں انتقال فرما گئے۔

۷- استاذ محمد مہدی عاکف (۱۹۲۸ء)

ساتویں مرشد عام کی شکل میں اخوان نے استاد محمد مہدی عاکف کو منتخب کیا۔[۲۴] ۶ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰ راکتوبر ۲۰۰۴ء کو مہدی عاکف نے مصر میں سیاسی اصلاحات کی دعوت دی اور افغانوں، عراقیوں اور فلسطینی عوام کی جدو جہد اور آزادی کی بھرپور حمایت کی۔ ملک کے اندرونی بحران پر مرشد عام نے گہری تشویش ظاہر کی۔ ۸ دسمبر ۲۰۰۵ء کے پارلیمانی انتخابات میں محمد مہدی عاکف کی سربراہی میں اخوان المسلمون کے سیاسی کارکنوں نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور اپنی حیران کن فتح سے مغربی میڈیا اور عرب دنیا کو ششدر کر دیا۔ اسلام پسندوں کی اس انتخابی پیش رفت نے صدر حسنی مبارک، امریکا اور دوسرے ملکوں کی حکومتوں کو شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔[۲۵]

مرشد عام محمد مہدی عاکف کی سربراہی میں اخوان المسلمون مصر اور عالمِ عرب میں احیاے اسلام کی جدو جہد میں مصروف رہی۔ بدلتے حالات میں دعوت وا قامتِ دین کی نئی راہیں انھوں نے تلاش کیں۔ آج وہ پورے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اسلامی معاشرے کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ آخر کار ۱۶ رجنوری ۲۰۱۰ء کو مرشد عام محمد مہدی عاکف نے اپنی خرابی صحت کی بنا پر انتخاب عام کروایا اور نئے مرشد کے ہاتھوں میں تنظیم کی باگ ڈور سونپ دی۔

۸-ڈاکٹر محمد البدیع

اخوان المسلمون کے نومنتخب آٹھویں مرشد عام ڈاکٹر محمد البدیع نے گذشتہ ایام میں ہزاروں

گرفتار ہونے والے افراد پر اظہار افسوس کیا۔[۲۶] ان قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود ڈاکٹر محمد البدیع نے ۱۶ جنوری ۲۰۱۰ء کو اپنے انتخاب کے بعد پہلے خطاب میں کہا: ''اخوان کبھی حکومت کے حریف اور دشمن نہیں رہے۔ ہم کبھی مخالفت براے مخالفت پر یقین نہیں رکھتے۔ خیر میں تعاون اور شر کی مخالفت کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے اور ہم اسی بنیاد پر حکومت کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتے ہیں''۔

اپنی پوری زندگی میں اللہ کی عبادت کرنا اور زندگی کے تمام شعبوں کو اس کی روشنی سے منور کرنا صرف اور صرف اخوان کی دعوت تھی۔ ۱۹۲۸ء میں قاہرہ میں پانچویں کانفرنس میں اخوان کے مشن اور دعوت کا تعارف کراتے ہوئے حسن البنّا نے فرمایا: ''الاخوان المسلمون ایک سلفی دعوت ہے۔ اس لیے کہ اخوان اسلام کی ابتدائی صورت کی طرف پلٹنے کی دعوت دیتے ہیں اور کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے اصل سرچشموں کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ ایک سنی مسلک بھی ہے، کیوں کہ ان تمام چیزوں میں بالخصوص عقائد و عبادات میں لوگ سنت رسولؐ پر گامزن ہیں۔

- یہ اہلِ تصوف کا ایک گروہ بھی ہے، کیوں کہ یہ خیر کی اساس، دل کی طہارت، نفس کی پاکیزگی، عمل پر مداومت، مخلوق سے درگزر، اللہ کے لیے محبت اور نیکی کے لیے یگانگت کو ضروری سمجھتی ہے۔
- یہ ایک سیاسی تنظیم بھی ہے، کیوں کہ اس کا مطالبہ ہے کہ حکومت کی اصلاح کی جائے، اس کی خارجہ پالیسی میں ترمیم کی جائے، رعایا کے اندر عزت واحترام کی روح پھونکی جائے اور آخری حد تک ان کی قومیت کی حفاظت کی جائے۔
- یہ ایک علمی و ثقافتی انجمن بھی ہے، اس لیے کہ اخوان کے کلب فی الواقع تعلیم و مذہب کی درس گاہیں اور عقل و روح کو جِلا دینے کے ادارے ہیں۔
- یہ ایک معاشرتی اسکیم بھی ہے، کیوں کہ یہ معاشرے کی بیماریوں پر دھیان دیتی، ان کا علاج دریافت کرتی اور امت کو صحت مند رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

اس طرح تصور اسلام کی جامعیت نے ہماری فکر کو اصلاحی پہلوؤں کا جامع بنا دیا ہے۔ چنانچہ اخوان نے ملک کے ہر طبقے کے لیے ہمہ جہتی خدمات انجام دیں۔ اخوان نے ایک طرف تعلیم یافتہ طبقے پر توجہ دی، تو دوسری طرف کسانوں اور مزدوروں کے طبقوں میں سرگرمیاں تیز کر دیں۔

قرآن وحدیث سے اسلام کا صحیح اور جامع تصور پیش کیا۔ طلبہ اور اساتذہ کے اندر دین کی روح پھونکی جس سے ہوا کا رخ ہی بدل گیا اور اہل علم وادب اسلامی نظام کی قصیدہ خوانی میں لگ گئے کہ:

''اسلام عقیدہ بھی ہے اور عبادت بھی، وطن بھی ہے اور نسل بھی، دین بھی ہے اور ریاست بھی، روحانیت بھی ہے اور عمل بھی، قرآن بھی ہے اور تلوار بھی''۔

میدان صحافت بھی اخوان کی توجہ کا مرکز رہا۔ روز نامہ اخوان المسلمون، ماہنامہ المنار، ہفتہ روزہ التعارف، الشعاع، النذیر، الشہاب، الدعوة، المباحث جاری کیے۔ تعلیم کے میدان میں اخوان کی خدمات وسیع پیمانے پر ہیں۔ مثلاً لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے علیحدہ فنی درسگاہیں قائم کرنا، مزدوروں اور کسانوں کے لیے شبینہ مدارس جاری کرنا، کمسن مزدور بچوں کے لیے تعلیم وتربیت کے شعبے قائم کرنا، صنعتی تعلیم کے مراکز قائم کرنا۔ اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے معاشی کمپنیاں قائم کیں۔ طبی خدمات کے پیش نظر صرف قاہرہ میں ۱۷ شفا خانے تھے۔ زراعت کے میدان میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں، نیز معاشرتی خدمات کے لیے ایک مستقل بورڈ قائم تھا۔[۲۷]

اخوان المسلمون کی جماعت میں ایسے مصنف پیدا ہوئے جنھوں نے جملہ مسائل پر اسلام کی مدلل اور بے لاگ ترجمانی کی۔ ان ادیبوں نے مصر کے علاوہ شام، لبنان، سعودی عرب، کویت، قطر، عراق، فلسطین، اردن عالم عرب اور عالم اسلام کے دوسرے ملکوں میں اپنی تحریروں کے تراجم کے ذریعے ہندوپاک کی اسلامی فکر کے ارتقا پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

سید قطبؒ (۱۹۰۶ء-۱۹۶۶ء)

پورا نام سید قطب ابراہیم شاذلی تھا۔ ۶ را کتوبر ۱۹۰۶ کو بالاے مصر کے اسیوط شہر کے گاؤں موشا میں پیدا ہوئے۔ والد ابراہیم قطب، مصطفیٰ کامل کی پارٹی الحزب الوطنی کے رکن تھے۔ دارالعلوم قاہرہ سے بی اے ایجوکیشن کی ڈگری حاصل کی۔ ایجوکیشن میں ایم اے کی ڈگری امریکا کے ولسنز ٹیچرز کالج سے لی۔ امریکا کے قیام میں آپ نے مغربی تہذیب کی بربادی کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور اسلام پر ان کے ایمان وایقان میں اضافہ ہوا۔

ابتدا میں طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد اور احمد حسن الزیات سے بڑے متاثر تھے، مگر بعد میں

ان کے اسلوب اور افکار کے مخالف اور ناقد بن گئے۔ ۱۹۵۳ء میں الاخوان المسلمون کے مدیر رہے، مکتب الارشاد کے رکن منتخب ہوئے۔ بیت المقدس میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ معاشرتی بہبود کے سرکل کی طرف سے مختلف موضوعات پر لیکچر دیے۔ انھیں ۲۹ راگست ۱۹۶۶ء کو پھانسی دی گئی۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۲۲ ہے: ○فی ظلال القرآن ○العدالة الاجتماعية فی الاسلام ○مشاهد القيامة فی الاسلام ○التصوير الفنی فی القرآن ○الاسلام العالمی والاسلام ○المدينة المسحورة ○القصص الدينية ○حلم الفجر ○الشاطئی المجهول[۲۸]

عبدالقادر عودة (م: ۱۹۵۴ء)

ممتاز قانون دان شیخ عبدالقادر عودہ، اخوان المسلمون کے رہنما تھے۔ شاہ فاروق کے زمانے میں مصری عدالت کے جج مقرر ہوئے، مگر غیر الٰہی قانون کے مطابق فیصلوں کے نفاذ کے سبب اس منصب سے استعفا دے دیا۔ موصوف متعدد کتابوں کے مصنف تھے، لیکن آپ کی کتاب التشريح الجنائی الاسلامی (اسلام کا قانون فوجداری) نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ آپ کی دیگر تصانیف اس طرح ہیں: ○الاسلام وأضاعناالقانونية (اسلام اور ہمارا قانونی نظام) ○الاسلام وأوضا عنا السياسية (اسلام اور ہمارا سیاسی نظام) ○المال والحكم فی الاسلام (اسلام میں مالیات اور حکمرانی کے اصول) ○الاسلام حائر بين جهل أبنائه وعجز علمائه (اسلام اپنے فرزندوں کی جہالت اور اپنے علما کی کوتاہ دستی پر حیران ہے![۲۹] دسمبر ۱۹۵۴ء میں جن چھے اخوانی رہنماؤں کو پھانسی کی سزا دی گئی ان میں عبدالقادر عودہ شہید بھی تھے۔

مصطفٰی محمد الطحان

۱۹۳۸ء میں لبنان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں استنبول یونی ورسٹی ترکی سے کیمیکل انجینیرنگ میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۹ء میں عالم عرب میں موجودہ استنبول یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ کی تنظیم قائم کی اور انھیں احیاے اسلام کے لیے جد وجہد کرنے پر اُبھارا۔ الاتحاد اسلامی العالمی للمنظمات الطلابيه (IIFSO) کویت کی تاسیس میں پیش پیش

رہے۔ ۱۹۸۰ء میں اس تنظیم کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔

فکر اسلامی اور دعوتی و جہادی تحریکات پر بیسیوں کتابیں لکھیں، جن میں سے چند یہ ہیں: Oالفکر الحرکی بین الا صالة والانحراف (تحریکی فکر۔ بنیاد پرستی اور انحراف کے درمیان) Oالحرکة الاسلامیه الحدیثة فی ترکب (ترکی میں جدید اسلامی تحریک) Oالقومیة بین النظریه والتطبیق (قومیت: نظریہ اور نفاذ) Oالنظام الاسلامی منهاج متفرد (اسلام: ایک منفرد نظام) Oالمرأة فی موکب الدعوة (دعوت دین اور خواتین) Oنظرات فی واقع المسلمین السیاسی (مسلمانوں کی سیاسی صورت حال پر چند مباحث)[۳۰]

ڈاکٹر طهٰ جابر العلوانی

آپ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں عراق میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء میں جامعۃ الازہر قاہرہ سے کلیۃ الشرعیہ سے بی اے، ایم اے اور اصول الفقہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامی فقہ آپ کی دل چسپی کا خصوصی موضوع ہے۔ آپ کی تصانیف اس طرح ہیں: Oالاجتهاد والتقلید فی الاسلام (اسلام میں اجتہاد اور تقلید) O حقوق المتهم فی الاسلام (اسلام میں ملزم اور متہم کے حقوق) Oادب الاختلاف فی الاسلام (اسلام میں اختلاف کے اصول) Oاصول الفقه الاسلامی منهج بحث و معرفة (اسلامی فقہ کے اصول اور منہاجیات) Oالأزمة الفکرية المعاصرة (معاصر فکری بحران)[۳۱]

ڈاکٹر عماد الدین خلیل

موصوف عراق کے شہر الموصل میں ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ جامعہ شمس قاہرہ سے ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں تاریخ اسلامی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل صلاح الدین یونی ورسٹی اردبیل عراق کے آرٹس کالج میں اسلامی تاریخ، منہاجیات و فلسفۂ تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ آپ ۵۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں اور سیکڑوں مقالات و مضامین لکھ چکے ہیں۔ آپ کی چند کتابیں یہ ہیں: Oآفاق قرآنیه (قرآن آفاق) O العلم فی مواجهة المادية (سائنس مادیت کے مقابلے میں) O حول اعادة تشکیل العقل المسلم (فکر اسلامی کی تشکیل

جدید) ○التفسیر الاسلامی للتاریخ (تاریخ کی اسلامی تفسیر) ○ دراسة فی السیرة (سیرت طیبہ پر ایک مطالعہ)[۳۲]

ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابو سلیمان

سعودی عرب کے شہر مکہ مکرمہ میں شوال ۱۳۵۵ھ/ دسمبر ۱۹۳۶ء میں آپ پیدا ہوئے۔ قاہرہ کالج آف کامرس سے پولیٹیکل سائنس میں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۷۳ء میں پنسلوانیا یونی ورسٹی سے اسلام اور بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کی اہم تحریریں یہ ہیں: ○قضیة المنهجیة فی الفکر الاسلامی (فکر اسلامی میں منہاجیات کا مسئلہ) ○أزمة العقل المسلم (فکر اسلامی کا بحران)[۳۳]

ڈاکٹر فتحی یکن

آپ کی پیدایش طرابلس میں ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم المعهد الامریکی سے حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں آپ نے کراچی یونی ورسٹی پاکستان سے اسلامک اسٹڈیز میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء میں لبنان کی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ دعوت وتحریک الاسلام کے مختلف موضوعات پر آپ کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں: ○الاسلام فکرة وحرکة وانقلاب (اسلام، نظریۂ تحریک اور انقلاب) ○ التربیة الوقائیة فی الاسلام (اسلام میں احتیاطی تربیت کا تصور) ○مشکلات الدعوة والداعیة (دعوت اور داعیان کرم کے مسائل) ○الصحوة الاسلامیه مقوماتها ومعوقاتها (اسلامی بیداری، فرائض اور رکاوٹیں)[۳۴]

ڈاکٹر سعید رمضانؒ (۱۹۲۶ء-۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر سعید رمضان مصر کے شہر طنطا میں ۱۲؍اپریل ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے۔ اخوانی رہنما اور عالم ڈاکٹر البہی الخولی کے ہاتھوں آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ نوجوانی میں جلاوطنی کے چند برس کراچی، پاکستان میں گزارے، جہاں پر جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ سے قربت پیدا ہوئی۔ آپ نے ۱۹۵۹ء میں کولون یونی ورسٹی جرمنی سے قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر رمضان نے عالمِ عرب، عالمِ اسلام اور یورپ کے بیش تر ملکوں میں اخوان کی فکر، طریق کار اور اصولوں کو عام کیا۔ مجلّہ شہاب کے بعد قاہرہ سے ماہنامہ المسلمون نکالا۔ آپ کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں: ○Three Major Problems Confronting the World of Islam (عالم اسلام کو درپیش تین اہم مسائل)[۳۵] ○Islamic Law:Its Scope and Equity (اسلامی قانون: امکانات اور اطلاق)

پروفیسر محمد قطب

استاذ محمد قطب سید قطب شہید کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پیدایش اسی خانوادہ میں ۲۶/اپریل ۱۹۱۹ء کو ہوئی۔ قاہرہ یونی ورسٹی سے انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کی۔ اس کے بعد ایجوکیشن میں ڈپلوما اور ایجوکیشن سائیکالوجی کا کورس مکمل کیا۔

پروفیسر قطب کا میدان کار ادب اور تصنیف کا رہا۔ آپ نے اسلام، دعوت اسلامی اور مسلمانان عالم کے موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: ○الانسان بین المادیة والاسلام (انسان مادہ پرستی اور اسلام کے درمیان) ○منهج الفن الاسلامی (اسلامی فن کی منہاجیات) ○فی النفس والمجتمع (نفسیات اور معاشرے کا مطالعہ) ○التطور والثبات فی الحیاة البشریة (انسانی زندگی میں جمود اور ارتقا) ○قبسات من الرسول (رسول اکرمؐ کی تعلیمات کی چند جھلکیاں)[۳۶]

زینب الغزالیؒ (۱۹۱۷-۲۰۰۵ء)

اخوان المسلمون کی اہم ادیبہ و مصنفہ کی پیدایش ۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر میں اور ثانوی تعلیم کے لیے سرکاری اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے علم حدیث، تفسیر اور دعوہ میں سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔ ۱۸ سال کی عمر میں ۱۹۳۶ء میں آپ نے 'جماعة السیدات المسلمات' کی بنیاد رکھی۔ آپ کی خودنوشت ایام من حیاتی (رودادِ قفس، ترجمہ: خلیل احمد حامدی) قید و بند کے ایام سے متعلّق ہے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اخوان کے ترجمان الدعوة، اور دوسرے رسالہ لواء الاسلام کے ذریعے قلمی جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ عالم اسلامی کی یہ معروف معلّمہ،

مبلغہ ۸/اگست ۲۰۰۵ء کو خالق حقیقی سے جاملیں۔[۳۷]

شیخ محمد الغزالیؒ (۱۹۱۷ء-۱۹۹۶ء)

مصر کے ممتاز عالم ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء میں بحیرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ محمد الغزالی نے ۱۹۴۱ء میں جامعۃ الازہر سے فراغت حاصل کی۔ مصر میں مساجد کونسل کے ڈائریکٹر، اسلامی دعوۃ کے ڈائریکٹر جنرل اور وزارت اوقاف میں انڈر سکریٹری کی حیثیت میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ شیخ محمد الغزالی نے کم وبیش ۴۰ کتابیں تصنیف کیں۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: ○ تأملات فی الدین والحیاۃ (دین اور زندگی کے چند مسائل پر غور وفکر) ○رکائز الایمان بین العقل والقلب (عقل وقلب کے درمیان ایمانی ذخیرے) ○عقیدہ المسلم (مسلم کا عقیدہ) ○الاسلام والطاقات المعطلۃ (اسلام اور معطل قوانین) ○من ھنا نعلم (یہاں سے ہمیں علم حاصل ہوتا ہے)[۳۸]

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعیؒ (۱۹۱۵-۱۹۶۴ء)

شیخ مصطفیٰ السباعی علما کے خانوادہ میں شہر حمص میں پیدا ہوئے۔ جامعۃ الازہر میں داخلہ لے کر آپ نے مصر کی اسلامی وسیاسی جدو جہد میں بھر پور حصّہ لیا۔ آپ کی کتابیں اس طرح ہیں: ○اشتراکیہ الاسلام (اسلام کا تصور اشتراکیت) ○السیرۃ النبویۃ .دروس و عبر (سیرت نبویؐ، عبرت ونصیحت کا خزینہ) ○من روائع حضارتنا (ہماری تہذیب کے تابناک پہلو) ○المرأۃ بین الفقہ والقانون (عورت اسلامی فقہ اور جدید قوانین کے تناظر میں)۔ آپ نے تین معروف علمی جرائد کی ادارت کے فرائض انجام دیے ○المنار ○المسلمون ○حضارۃ الاسلام۔[۳۹]

عبدالبدیع صقر

عبدالبدیع صقر ابراہیم، اخوان المسلمون کے سابقوں الاولون میں سے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں امام حسن البنّا سے ملاقات ہوئی تو ان کی فکر اور شخصیت کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ شیخ صقر نے ۱۹۴۰ء میں اپنی معروف کتاب کیف ندعوا الناس؟ تصنیف کی اور دعوت دین کے طریقۂ کار پر کھل کر گفتگو کی۔ آپ نے انفرادی تزکیہ وتربیت پر زیادہ زور دیا اور اسے کلیدِ انقلاب قرار دیا۔ چند

تصانیف کے نام یہ ہیں: ○لأخلاق للبنات (لڑکیوں کا اخلاق) ○التجوید و علوم القرآن (تجوید اور علوم قرآن) ○التربیة الأساسیة للفرد المسلم (مسلمان کی بنیادی تربیت) ○رسالة الایمان ○الوصایا الخالدة (دائمی نصیحتیں)۔[۴۰]

عبد الفتاح ابوغدہؒ (۱۹۱۷ء-۱۹۹۷ء)

شیخ عبدالفتاح بن محمد بشیر بن حسن ابوغدّہ شمالی شام کے شہر حلب الشهباء میں ایک دین دار تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی شہر میں المدرسة العربیة الاسلامیہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کلیة الشریعة جامعة الازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۴۴-۱۹۴۸ء میں وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ دعوتی و تبلیغی میدان میں شیخ ابوغدّہ کی شخصیت بڑی ممتاز تھی۔ آپ کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں: ○ العلماء العزاب الذین أ ثر والعلم علی الزواج (شادی پر علم کو ترجیح دینے والے علما) ○قیمة الزمن عند العلماء (علما کے نزدیک وقت کی قدر و قیمت) ○الرسول المعلم وأسا لیبه فی التعلیم (معلم انسانیت اوران کے تعلیمی طریقے) ○امراء المومنین فی الحدیث (مسلمان حکمران حدیث کی روشنی میں)۔[۴۱]

محمد محمود الصوافؒ (۱۹۱۵ء-۱۹۹۲ء)

محمد محمود الصواف اوائل شوال ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء شمالی عراق کے شہر الموصل میں پیدا ہوئے۔ آغاز عمر ہی سے طلب علم کے بڑے دل دادہ تھے۔ علوم شریعت کی تحصیل کے لیے جامعة الازہر کا رُخ کیا اور چھے سالہ نصاب کی تکمیل تین سال ہی میں کرڈالی۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ مطابق ۹/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ موصوف نے مختلف علمی و دینی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں چند کے نام یہ ہیں: ○المسلمون و علم الفلك (علم فلکیات اور مسلمان) ○القیامة رای العین (قیامت کا چشم دید منظر) ○زوجات النبی الطاهرات (اُمہات المومنینؓ) ○رِحلاتی الی الدیار الاسلامیه (سفرنامہ عالم اسلام)۔[۴۲]

ڈاکٹر نجیب الکیلانی (۱۹۳۱ء-۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر نجیب الکیلانی ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں ایک مصری گاؤں شرشابہ میں ایک کسان خاندان

میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں طنطا سے ثانویہ کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ پھر میڈیکل کالج قاہرہ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۰ء میں طب کی ڈگری حاصل کی۔ طبابت کے پیشے کے ساتھ تعمیری، بامقصد ناول، ڈرامے اور قصے بھی برابر لکھتے رہے۔ ڈاکٹر کیلانی نے ۷۰ سے زائد کتابیں لکھیں۔ ناول، قصوں کے ساتھ شعر، تنقید، فکر اسلامی اور طب کے تمام پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ تصانیف: ارض الانبیاء، لیالی ترکستان، عمالقة الشمال وغیرہ اور تاریخی ناول میں مملکته الغیب، امرأة عبدالمتجلی، أقوال ابوالفتوح الشرقاوی بہت اہم ہیں۔ شاعری کے میدان میں عصر الشہدا، أغانی الغرباء، مدینة الکبائر وغیرہ اور تنقید میں الاسلامیه والمذاهب الأدبية، مدخل الی الادب الاسلامی اور علی أسوار دمشق، علی ابواب خیبر وغیرہ ڈرامے بڑے قابل قدر ہیں۔[۴۳]

اسلامی تحریک کی کامیابی کے لیے عمدہ نظم و نسق اور جامع مکمل منصوبہ بندی ناگریز ہے۔ یہ دونوں اوصاف حالات کے تھپیڑوں، شدائد و مظالم کے طوفان کا جم کر مقابلہ کرسکتے ہیں اور کامیابی سے ہم کنار کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں اسلامی تحریکوں نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے:

۱- تمام اسلامی تحریکوں نے تربیت و تزکیہ کے تمام پہلوؤں پر کافی توجہ دی ہے۔ تربیتی کارگاہوں کا انعقاد، عربی، اردو، انگریزی اور دوسری مقامی و بین الاقوامی زبانوں میں تربیتی کتب کی تصانیف اور ایک زبان سے دوسری زبان میں تراجم اس کا اہم حصّہ ہیں۔ الاخوان المسلمون کی تربیتی ادبیات میں تزکیہ و تربیت سے متعلّق کتب کی ایک طویل فہرست ہے۔

۲- اسلامی تحریکات میں فرد کی تربیت کی بنیادی اہمیّت ہے، کیوں کہ اسلامی شریعت کا خطاب سب سے پہلے فرد سے ہے، اور افراد کی اصلاح و تزکیے کے ذریعے صالح اجتماعیت وجود میں آسکتی ہے۔

۳- الاخوان المسلمون کے بانی شیخ حسن البنا شہیدؒ نے بیعت کے ۱۰ ناگزیر اجزا پر زور دیا ہے جو دراصل اسلامی شخصیت کے عناصر ترکیبی ہیں: ۱-فہم ۲-اخلاص ۳-عمل ۴-جہاد ۵-قربانی ۶-اطاعت کیشی ۷-ثابت قدمی ۸-یکسوئی ۹-بھائی چارہ ۱۰-باہمی اعتماد۔

۴- اخوان المسلمون نے فرد کے اخلاقی و روحانی تزکیے کے لیے جو نظام ترتیب دیا ہے

اس میں متصوفانہ اصطلاحات سے اجتناب کرتے ہوئے عام فہم اور آسان الفاظ میں فرد کے اخلاقی اوصاف ومحاسن سے بحث کی ہے۔

۵- جماعت اسلامی ہندستان، پاکستان، بنگلہ دیش نے فرد کی تربیت وتزکیہ کا جو نظام ترتیب دیا، اس میں بنیادی اہمیّت قرآن وحدیث کے براہ راست مطالعے کو حاصل رہی۔ مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن، مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبرقرآن اور سید قطب کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اُردو ترجموں نے کارکنوں کی تربیت پر زبردست اثرات مرتب کیے۔

۶- الاخوان المسلمون کے تربیتی نظام میں اوراد و اذکار کا اہتمام، وظائف، نوافل، اور تہجد گزاری شامل تھے۔ اور 'احتسابی چارٹ' کی خانہ پری تزکیۂ نفس کے لیے ضروری قرار دے دی گئی تھی۔

مقالہ نگار شعبہ علومِ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، بھارت میں استاد ہیں

حواشی و تعلیقات

۱- شیخ علی عبدالرازق (۱۸۸۸ء-۱۹۶۶ء) کی مشہور تصنیف: الاسلام وأصول الحکم بحث فی الخلافة والحکمة فی الاسلام قاہرہ سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔

۲- ڈاکٹر طٰہٰ حسین (۱۸۸۹ء-۱۹۷۱ء) مصر کے مشہور ناول نگار۔ الشعر الجاهلی کے علاوہ مستقبل الثقافة فی مصر بھی آپ کی کتاب ہے جس میں مغرب کی تقلید پر بڑا زور دیا گیا ہے

۳- قاسم امین (۱۸۶۳-۱۹۰۸ء) مصر کے معروف ادیب جن کو 'محرر المرأة' کا خطاب دیا گیا۔

۴- سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء-۱۸۹۷ء) افغانستان کے شہر اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی کتابیں تاریخ الافغان، رسالة الردّ علی الدهر یین طبع ہو چکی ہیں۔

۵- مفتی محمد عبدہٗ (۱۸۴۹ء-۱۹۰۵ء)۔ رسالة التوحید، رسالہ الواردات، الاسلام و النصرانیة مع العلم والمدینة آپ کی اہم تصنیفات ہیں۔ اسکندریہ میں آپ کی وفات ہوئی۔

۶- سید محمد رشید رضا (۱۸۶۵ء-۱۹۳۵ء) نداء للجنس اللطیف، یسرا لاسلام وأ صول التشریع العام، الوها بیون والحجاز آپ کی اہم کتابیں ہیں۔

۷- مصطفیٰ صادق الرافعی (۱۸۸۱ء-۱۹۳۷ء) اعجاز القرآن البلاغة والنبوته اور تحت رأیة القرآن، ان کی معروف تصانیف ہیں۔ آپ کی طنطا میں وفات ہوئی۔

۸- محمد فرید وجدی (۱۸۷۸ء-۱۹۵۴ء) کی پیدایش اسکندریہ میں ہوئی۔ دائرۃ معارف القرآن، الرابع عشر العشرین آپ کا علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔

۹- محبّ الدین الخطیب (۱۸۸۶ء-۱۹۶۹ء)، کتب: تاریخ مدینۃ الزھراء بالأندلس، الرعیل الاول فی الاسلام، اتجاہ الموجات، الشریۃ فی جزیرہ العرب۔

۱۰- شیخ حسن البنا کے احوال کے لیے، پڑھیے: امام حسن البنا، ایک مطالعہ، مرتبہ: عبدالغفار عزیز، سلیم منصور خالد، ۲۰۱۱ء، منشورات، منصورہ، لاہور، پاکستان

۱۱- خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون، تاریخ دعوت، خدمات، ۱۹۸۱ء ص ۴۳-۴۴

۱۲- انور الجندی، حسن البنّا الداعیۃ، الامام المجد دار دو ترجمہ محمد سمیع اختر حسن البنا شہید، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱۸۔

۱۳- حسن الہضیبی مصری کالج سے قانون کی ڈگری لی ۲۷ سالوں تک جج کے فرائض انجام دیے۔

۱۴- خلیل احمد حامدی حوالہ بالا، ص ۱۲۷

۱۵- سید عمر تلمسانی ۴ر نومبر ۱۹۰۴ء کو قاہرہ کے علاقہ غوریہ میں پیدا ہوئے۔ بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یونی ورسٹی لا کالج میں داخل ہوئے۔

۱۶- The Oxford Encyclopaedia of the Modern Islamic World, 1995. vol2,p.354-356,article on Al Jamaat,at-Islamia

۱۷- سید عمر تلمسانی، یادوں کی امانت، (ترجمہ: حافظ محمد ادریس) مدینہ پبلشنگ سینٹر، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۳۵۷-۳۵۹

۱۸- استاذ محمد حامد ابوالنصرؒ فریدی، ۱۹۱۳ء میں مصر کے شہر منفلوط میں پیدا ہوئے۔

۱۹- ہفت روزہ المجتمع کویت، شمارہ ۱۱۷۸، ۵ر دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۳۰-۳۲

۲۰- حاضر العالم الاسلامی عام ۱۹۲۲م، المرکز العالمی للکتاب الاسلامی، کویت، ص ۹۷-۹۸

۲۱- استاذ مصطفیٰ مشہور، قاہرہ کلیۃ العلوم سے فلکیات اور رصد کاری میں گریجویشن کیا۔

۲۲- عبیداللہ فہد فلاحی، اخوان المسلمون، القلم پبلی کیشنز، کشمیر، ۲۰۱۱ء، ص ۳۹-۴۳

۲۳- آپ کے والد حسن اسماعیل الہضیبی نامور قانون دان تھے۔ ۲۸ مئی ۱۹۲۱ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ کلیۃ الحقوق سے گریجویشن کے بعد مصر کی عدالت میں بحیثیت جج تقرر ہوا۔

۲۴- استاذ محمد مہدی عاکف ۲۱ر جولائی ۱۹۲۸ء کو مصری ڈیلٹا کے قہلیہ خطہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں فیزیکل ہیلتھ ایجوکیشن کالج سے گریجویشن کی تکمیل کی۔

۲۵- *The Guardian*، *Egypt's New Dilemma*، لندن، ۹ دسمبر ۲۰۰۵ء

۲۶- ڈاکٹر محمد البدیع۔ مصری سائنسی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق عرب دنیا میں پتھالوجی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

۲۷- خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون، تاریخ دعوت خدمات، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

۲۸- عبیداللہ فہد فلاحی۔ سید قطب شہید کی حیات وخدمات کا تجزیہ، دہلی، ۱۹۹۳ء

۲۹- خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون، ص ۸۷

۳۰- مصطفیٰ محمد الطحان، وسط ایشیا میں اسلام کا مستقبل، ترجمہ ڈاکٹر عبیداللہ فلاحی، ۱۹۹۶ء

۳۱- Taha Jabir al-Alwani, Ijtihad, International Institute of Islamic Thought, Herndon, USA,1993.P32

۳۲- عماد الدین خلیل، مدخل الی اسلامیة المعرفة مع مخطط مقترح ا لا سلامیة علم التاریخ المعهد العالمی للکفر الاسلامی، ہیرنڈن امریکا ۱۹۹۱ء ص ۲

۳۳- Abdul Hamid A. Abu Sulayman, The Islamic Theory of International Relations, IIIT, Herndon,1987,P.2

۳۴- ہفت روزہ المجتمع کویت، شمارہ ۱۱۵۲، ۶/جون ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۳۵- ہفت روزہ المجتمع ۱۱۶۲، ۱۵/اگست ۱۹۹۵ ص ۴۱

۳۶- محمد اشرف علی، محمد قطب۔ مساهمته فی النثر العربی الحدیث، غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ، زیر نگرانی ڈاکٹر صلاح الدین عمری، شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۹۵ء

۳۷- زینب الغزالی، ایام من حیاتی، بیروت دار القرآن الکریم، للعنایہ بطبعہ ونشر علومہ، ص ۱۷۰-۱۷۱

۳۸- قطب عبدالحمید قطب، خطب الشیخ محمد الغزالی فی شئون الدین والحیاة، دارالاعتصام، قاہرہ، ۱۹۸۷ء، الجزء الاول ص ۱۳-۱۷

۳۹- The Oxford Encyclopedia of the Modern-Islamic World, vol. 1V,p.71-72

۴۰- عبدالبدیع صقر، کیف ندعوالناس، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع ششم، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰ و ۱۶۵۔

۴۱- المجتمع کویت، شمارہ ۱۲۳۹، ۲۵/فروری ۱۹۹۷ء، ص ۳۴-۳۷۔

۴۲- " ۱۲۷۰، ۷/اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۵۱۔

۴۳- " ۱۳۲۶، ۱۷/نومبر ۱۹۹۸ء، ص ۴۸-۵۰۔

۴۴- عبیداللہ فہد فلاحی، اخوان المسلمون، القلم پبلی کیشنز ۲۰۱۱ء ص ۲۰۹-۲۴۳۔

اقبال اور سیکولرزم

بشیر احمد ڈار

لفظ 'سیکولر' اپنے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں یورپ کے مذہبی ماحول کی پیداوار ہے۔ عیسائی مذہب کی جو تشریح اور تعبیر پولوس نے کی، اس میں چند اخلاقی اصول تو موجود تھے، لیکن شریعت کی اس میں کوئی گنجایش نہ تھی۔ اس زمانے کے مروجہ باطنی مذاہب اور اسرار میں یہ تصور موجود تھا کہ انسانی روح ایک پاکیزہ شے ہے، جو بدقسمتی سے اس مادی دنیا کی قید میں اسیر ہوگئی ہے۔ اس لیے انسان کا نصب العین یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے، اس دنیاوی زندگی کی آلایش سے اپنے آپ کو پاک رکھا جائے۔ انھی تصورات کے زیراثر پولوس نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کو اس طرح پیش کیا کہ گویا وہ بھی اسی مقصد کی خاطر اس دنیا میں آئے تھے۔ چنانچہ پہلی دو تین صدیوں تک عیسائیوں کی کثیر تعداد اپنی انفرادی نجات کی کوششوں میں منہمک رہی۔ معاشرتی اور تمدنی ذمہ داریاں ان کے نزدیک کوئی اہمیّت نہیں رکھتی تھیں۔ عیسائیت ایک نظامِ رہبانیت تھا، جو اس ناپاک دنیا میں قائم کیا گیا اور جس کا مدنی اُمور میں کوئی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے، وہ ہر معاملے میں رومی حکومت کے زیرفرمان رہی۔ قسطنطین نے بادشاہ بننے کے بعد عیسائیت قبول کرلی۔ اس نے کوشش کی کہ اس نئے مذہب کی بنیاد پر رومی سلطنت میں اتحاد و یگانگت پیدا کرسکے لیکن حقیقت میں عیسائیت بطور نظامِ اجتماع نہ اُس وقت کارآمد تھی اور نہ اس وقت کارآمد ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قسطنطین کے جانشین جولین نے پھر سے دیوتا پرستی کی طرف رجوع کیا اور اس کی فلسفیانہ تاویلات سے لوگوں میں وحدتِ افکار و کردار پیدا کرنے کی کوشش کی۔

انھی قدیم باطنی اَسرار اور عیسائیت کے تصورات کی آمیزش سے مانی نے اپنا فلسفۂ حیات

پیش کیا۔ اس کی نمایاں خصوصیت جسم و روح، مادیت و روحانیت، یزدان و اہرمن کی مطلق ثنویت ہے جن میں کسی قسم کا نقطۂ اتصال موجود نہیں۔ اس مانوی تحریک نے عیسائیت کے ارتقا پر بڑا اثر ڈالا۔ اگستائن جس نے کلیسا کی ابتدائی تاریخ میں ایک مؤثر کردار ادا کیا ہے، عیسائیت قبول کرنے سے پہلے مانوی مذہب ہی کا پیرو تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ نور و ظلمت کی مانوی ثنویت کے افکار اس کے باعث عیسائیت میں رائج ہوئے۔ جیسا کہ اقبال نے خود ایک جگہ کہا ہے کہ ''مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ مانویت کے زیراثر قبول کرلیا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، روح اور مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر ترک کردینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ، روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔

خطبات میں فرماتے ہیں کہ ''اسلام نے روحانی اور مادے کی تفریق کبھی روا نہیں رکھی۔ کسی عمل کی ماہیت کا فیصلہ اس لحاظ سے نہیں کیا جاتا کہ اس کا تعلّق کسی حد تک حیاتِ دنیوی یا سیکولر سے ہے، بلکہ اس کا انحصار صاحبِ عمل کے ذہنی رجحان پر ہے۔ اگر زندگی کی مقصدیت کو سامنے نہیں رکھا جاتا تو ہمارا عمل دنیوی ہے، اور اگر یہ مقصدیت ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں تو ہمارا عمل روحانی ہے۔ قرآن پاک کے نزدیک حقیقت مطلقہ محض روح ہے اور اس کی زندگی عبارت ہے اُس فعالیت سے جس کو ہم زمانے میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ طبیعی اور مادی اور دنیوی ہی تو ہے جس میں روح کو اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے اور اس لیے ہر وہ شے جسے اصطلاحاً سیکولر کہا جاتا ہے اپنی اصل میں روحانی تسلیم کی جائے گی''۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۴۷-۲۴۹)

تن و جاں را دوتا گفتن کلام است　　تن و جاں را دوتا دیدن حرام است
بہ جاں پوشیدہ رمزِ کائنات است　　بدن حالے ز احوالِ حیات است

(تن و جاں کو الگ الگ کہا تو جاسکتا ہے، مگر انھیں الگ الگ سمجھنا حرام ہے۔ جان کے اندر کائنات کا راز پوشیدہ ہے، بدن احوالِ حیات میں سے ایک حال ہے)۔

زندگی کے اس غلط نقطۂ نظر کے باعث عیسائی مذہب میں شروع ہی سے کلیسا اور ریاست

کے درمیان ایک قسم کا بُعد اور تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ صحیح ہے کہ کلیسائی اقتدار اور حاکمیت نے کافی عرصے تک یورپ کے مختلف ملکوں میں خالص دینی بنیاد پر اتحاد و یگانگت قائم رکھی لیکن لوتھر کی بغاوت سے یہ حالات یکسر بدل گئے۔ ہزار برائیوں کے باوجود کلیسائی اقتدار نے مذہبی اور اخلاقی اقدار کو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نصب العین بنایا ہوا تھا۔ لوگ زندگی کے ہر پہلو کو مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ کے مطابق ڈھالتے تھے۔ ان کی معاشرتی طرزِ زندگی، ان کا اقتصادی اور معاشی نظام، سلطنتوں کے باہمی میل جول سبھی اخلاقی اصولوں کی روشنی میں طے پاتے تھے۔ لیکن لوتھر نے جب کلیسا کے خلاف آواز اُٹھائی تو اس سے بہت سے دیگر نتائج کے علاوہ دو باتیں خاص طور پر ظاہر ہوئیں۔ پروٹسٹنٹ راہنماؤں نے مروجہ مذہبی رسوم پر بڑی سخت تنقید کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ کلیسا کی حاکمیت کے زیراثر افراد کی آزادی اور اختیار ختم ہو چکا ہے۔ وہ مذہبی اور اخلاقی معاملات کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں۔ آخری فیصلہ ہر معاملے میں کلیسا کا ہوتا ہے۔ اس کے خلاف ان راہنماؤں کا موقف یہ تھا کہ اخلاق کا آخری معیار ہر انسان کا اپنا دل اور ضمیر ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کی سماجی اہمیت ختم ہوگئی۔ ہر آدمی کو اجازت تھی کہ وہ اپنی داخلی زندگی میں مذہب سے وابستگی قائم رکھتے ہوئے زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس طرح چاہے عمل کرے۔ مذہب محض ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق اس کی باقی ماندہ زندگی سے کچھ نہیں اور نہ ہونا چاہیے۔ اس اصول کے تحت مذہب اور ریاست میں مکمل علیحدگی اور تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ تفریق ایک معنی میں اسی فلسفیانہ ثنویت کا منطقی نتیجہ تھی جو مغربی حکما نے بقول اقبال مانی کے زیراثر اختیار کی تھی:

بدن را تا فرنگ از جاں جدا دید — نگاہش ملک و دیں راہم دوتا دید
کلیسا سبحۂ پطرس شمارد — کہ او با حاکمی کارے ندارد
بہ کارِ حاکمی مکر و فنے بیں — تنِ بے جان و جانِ بے تنے بیں

(جب فرنگ نے بدن کو روح سے الگ دیکھا تو پھر اس نے حکومت اور مذہب کو بھی جدا جدا کر دیا۔ کلیسا صرف پطرس کی تسبیح شمار کرتا رہا، اسے حکومت سے کوئی سروکار نہ رہا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں حکومت مکروفن پر مبنی ہے، تن بے جان ہوگیا، اور جان بے تن)۔

ملک و دین ــــــ ریاست اور مذہب، مملکت اور اخلاق کی اس جدائی کا علَم بردار میکیاولی

تھا جس نے اپنی کتاب پرنس (شہزادہ) میں حکومت کے معاملات میں مذہب اور اخلاق کو برطرف کر کے خالص ابن الوقتی حکمت عملی کی تلقین کی۔ اس باطل پرست اطالوی مفکر کے نزدیک مملکت ہی 'معبود' یعنی نصب العین ہے، جس کی ضروریات کسی قانونِ اخلاق کے تابع نہیں:

باطل از تعلیم او بالیدہ است حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بچشم اہلِ عالم چیدہ است مصلحت تزویر را نامیدہ است

(اس کی تعلیم سے باطل نے فروغ پایا اور حیلہ اندازی نے فن کی صورت اختیار کر لی۔ اس نے ایسے مسلک کی بنیاد رکھی جس کا انجامِ بہت بُرا تھا اور اس طرح زمانے کی راہ میں کانٹے بکھیر دیے۔ اس نے دنیا والوں کی آنکھوں کے سامنے رات کی تاریکی پھیلا دی اور مکروفن کا نام مصلحت رکھ دیا)۔

اس 'حیلہ اندوز' اور 'پُر از تزویر سیاست کو اقبال 'لادین سیاست' یعنی سیکولرزم کا نام دیتا ہے:

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادین کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

دین و اخلاق سے بے نیازی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنی انفرادی زندگی میں اخلاق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور مذہب کے احکام کی پیروی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے، لیکن جب وہی افراد ریاست و حکومت کے معاملات اور بین الاقوامی مسائل پر غوروخوض شروع کرتے ہیں تو ہر قسم کے اخلاقی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی سیاست فساد فی الارض کا ایک بدترین سرچشمہ ہے۔ اقتدار کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں ہو یا عوام کے ہاتھوں میں، جب بھی سیاست کو اخلاق سے علیحدہ رکھا جائے گا تو اس سے فتنہ وفساد ہی پیدا ہو گا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس چنگیزی کے باعث انسان کی تمدنی زندگی تباہی سے دوچار ہے۔ ہر قسم کی ترقی کے باوجود انسان اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہیں۔ معاشی زندگی میں استحصال و لُوٹ، سماجی زندگی میں بے چینی اور خودغرضی، بین الاقوامی سطح پر باہمی بداعتمادی، جنگ کی خوف ناک

تیاریاں، یہ سب پریشان کن حالات اقبال کے خیال میں صرف سیکولر نقطۂ نگاہ اختیار کرنے کا نتیجہ ہیں:

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد زیر گردوں رسمِ لادینی نہاد
گرگے اندر پوستینِ برۂ ہر زماں اندر کمینِ برۂ
مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست آدمیت را غمِ پنہاں ازوست

(یورپ اپنی تلوار سے خود ہی گھائل ہو چکا ہے۔ اس نے دنیا میں رسمِ لادینی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس کی حالت اس بھیڑیئے کی سی ہے جس نے بکری کے بچے کی کھال اُوڑھ رکھی ہے۔ وہ ہر لمحے ایک نئے برہ کی گھات میں ہے۔ نوعِ انسان کی ساری مشکلات اس کی وجہ سے ہیں۔ اسی کی وجہ سے انسانیت غمِ پنہاں میں مبتلا ہے)۔

یہاں تک کہ وہ علم و تحقیق جو اقبال کے نزدیک انسانی خودی کے استحکام کے لیے ضروری ہے، اس لادین نقطۂ نگاہ کے زیر اثر قومی خودی کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ تسخیر کائنات کا مقصد انسان کو اس دنیا میں صحیح معنوں میں نائب حق کے منصب کا اہل بنانا تھا لیکن بدقسمتی سے اس سیکولر رجحان نے اس میں وہ زہر ملا دیا ہے جس کے باعث خود 'مار ہادر پیچ وتاب':

علم اشیا خاکِ ما را کیمیا ست آہ! در افرنگ تاثیرش جدا ست
آہ! از افرنگ و از آئینِ او آہ از اندیشۂ لادینِ او
اے کہ جاں را باز می دانی ز تن سحرِ ایں تہذیبِ لادینے شکن

(علم اشیا کائنات نے ہماری خاک کو کیمیا بنا دیا ہے مگر افسوس کہ اہلِ فرنگ پر اس کی تاثیر مختلف انداز میں ظاہر ہوئی۔ افسوس ہے افرنگ پر اور اس کے طریق کار پر، اس کی لادین فکر پر بھی افسوس ہے۔ اے مسلمان! تو جو رُوح کو بدن سے الگ سمجھتا ہے اُٹھ اور اس لادین تہذیب کے جادو کو توڑ دے)۔

یہی علم خیرِ کثیر ہے۔ اگر اس کا تعلق حق تعالیٰ سے ہو۔ اگر دین و اخلاق کے سرچشمے سے رابطہ موجود ہو تو یہ علم پیغمبری کے ہم پایہ ہے۔ لیکن جب یہ علم سوزِ دل سے عاری ہو جائے اور حق سے بیگانگی کا مظہر ہو، تو یہ بجائے خیرِ کثیر کے شرِّ اعظم بن جاتا ہے، جس کے فساد کی لپیٹ میں اس وقت ساری دنیا پھنسی ہوئی ہے۔ اس کا واحد علاج اقبال کی نگاہ میں لادینیت کو ہمیشہ کے لیے ختم

کرنا ہے۔ انسانی زندگی میں سکون واطمینان، راحت وسعادت تبھی ممکن ہے کہ دین ودنیا کی دوئی ہمیشہ کے لیے ختم کردی جائے۔ اخلاق اور سیاست کی بے تعلقی کے باعث جو غیر متوازن حالات پیدا ہوئے ہیں، اس کو اقبال نے بڑے عمدہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی　　سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں　　کہ وہ سربلندی ہے، یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا　　چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی　　ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی　　دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا　　بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی　　کہ ہوں ایک جنّیدی و اردشیری

جب علم وقوت، لادینی سے متاثر ہوں تو زہر ہلاہل سے زیادہ خوف ناک ہیں لیکن جب یہی علم وقوت، دین واخلاق سے مربوط ہوں تو زہر کا تریاق اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ ایوبی اور نگاہ بایزید ایک ذات میں موجود ہونا ہی انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔ جب انسان اس نہ سپہر کے طلسم کو توڑ دیتا ہے لیکن اس کے نشیب وفراز، رنج وراحت سے متاثر نہیں ہوتا تبھی دنیا فساد وفتنہ سے محفوظ رہ سکتی ہے ؎

شکوہِ خسروی این است این است
ہمیں ملک است کوتوام بہ دین است

(بس یہی شکوہ خسروی ہے، یہی سلطنت ہے جو دین کے ساتھ جڑواں ہے)۔

لادینیت کا ایک دوسرا مظہر وطن کا غلط تصور ہے۔ بدقسمتی کہنا چاہیے کہ اس خطرناک نظریے کا آغاز بھی تحریک اصلاحِ کلیسا کے ہاتھوں ہوا۔ جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جاچکا ہے۔ کلیسائی حاکمیت کے باعث تمام عیسائی ممالک ایک رشتۂ اخوت میں منسلک تھے اور اس اتحاد واخوت کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی یگانگت پر تھی۔ جب لوتھر نے کلیسا کے اس عالم گیر نظام کو ختم کردیا تو ہر ملک کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے کسی نفسیاتی بنیاد کی ضرورت تھی۔ یہ نفسیاتی بنیاد نظریۂ وطن ونسل نے

فراہم کی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ لوتھر کی یہ بغاوت درحقیقت جرمن قومیت کی سرفرازی کے لیے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیح کے عالم گیر نظامِ اخلاق کے بجاے بے شمار اخلاقی نظام وجود میں آئے۔ چنانچہ اہلِ مغرب کی نگاہیں اس عالم گیر انسانی نصب العین سے ہٹ کر اقوام وملل کی تنگ حدود میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ اس کے لیے انھیں وطنیت کے تصور سے زیادہ اور کوئی بہتر اساس میسر نہ آئی۔

وطنیت کی یہ اساس اپنے بنیادی مفہوم میں انسانی جماعت کی ہیئت کا ایک سیاسی اصول ہے، جس کے مطابق ایک خاص جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگ جو ایک ہی زبان اور نسل سے تعلّق رکھتے ہیں، اس وطن کو اپنا معبُود اور نصب العین قرار دیتے ہیں۔ وطن ہی ان کی تمام وفاداریوں کا مرکز ہے اور وہی نیکی اور بدی، خیروشر کا آخری معیار۔ اس لیے اقبال نے مختلف جگہ 'وطن' کو دیوتا اور خدا کے نام سے پکارا ہے۔ع ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ وطنیت کا یہ سیاسی نظریہ انسانیت کے لیے سمِ قاتل ہے کیونکہ اس کے باعث انسان آدمیت سے محروم ہو کر اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیرِ ملّت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انسان را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است — تلخیِ پیکارِ بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

(اہلِ مغرب نے اس طرح اخوت کی جڑ کاٹی ہے کہ وطن کی بنا پر قوم کی تعمیر کی ہے۔ وطن کو شمعِ محفل بنانے سے نوعِ انساں مختلف قبائل میں تقسیم ہوگئی ہے۔ انھوں نے جہنّم میں جنت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر تک پہنچا دیا ہے۔ وطنیت کے شجر نے دُنیا سے جنت (امن وسکون) رخصت کر دیا ہے۔ اس درخت کا پھل جنگ کی تلخی کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ دونوں عالمی جنگیں وطنیت کی بنا پر لڑی گئیں۔ انسانیت دُنیا میں افسانہ بن کر رہ گئی۔ آدمی آدمی سے بیگانہ ہو گیا)۔

اسلام کا مقصد محض انسانوں کی اخلاقی اصلاح نہیں بلکہ ان کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب پیدا کرنا ہے جو قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو بدل کر خالص انسانی شعور پیدا

کرے۔ ''اسلام نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی، نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ، بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد تمام فطری امتیازات کے باوجود عالمِ بشریت کو متحد اور منظم کرنا ہے۔ ایسا نظام صرف عقائد کی بنا پر ہی قائم ہوسکتا ہے۔ صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے عالمِ انساں کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے''۔ (حرف اقبال، ص ۲۵۱-۲۵۲)

یہ اساسی عقیدہ اقبال کے خیال میں صرف توحید ہے جس کی بنا پر انسانی سوسائٹی کو ایک بہتر طریقے سے منظّم کیا جاسکتا ہے۔ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ہماری وفاداریاں ملوک وسلاطین اور دیگر سارے مفادات سے ہٹ کر صرف ذاتِ الٰہی سے مخصوص ہوجائیں۔ چونکہ یہ ذات الٰہیہ فی الحقیقت زندگی کی روحانی اساس ہے، اس لیے اللہ کی اطاعت دوسرے لفظوں میں انسان کی اپنی فطرتِ صحیحہ کی اطاعت ہوئی۔ جب اس اصل توحید کو سیاسی اصولِ عمل کی حیثیت دی جاتی ہے تو اس سے انسان کو بحیثیت انسان دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت ملک، قوم، رنگ نسل وغیرہ کے امتیاز بالکل ختم ہوجاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک قابلِ امتیاز اگر کوئی شے ہے تو وہ انسانی اعمال کا اچھا اور بُرا ہونا ہے نہ کہ اس کا رنگ ونسل وغیرہ۔ ''وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل وزبان ورنگ سے بالا ہو۔ جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ ونسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح وسعادت کی زندگی بسر نہ کرسکے گا'' (ایضاً، ص ۲۴۷) ۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

(آدم کا مقام آسمان سے بھی بلند تر ہے، احترامِ آدم ہی تہذیب کی بنیاد ہے)۔

اقبال نے جب بین الاقوامی سطح پر جمعیت اقوام کی مخالفت کی تو اس کا باعث بھی اس نظریۂ وطنیت کی مخالفت تھی۔ اس کے خیال میں کوئی ایسا بین الاقوامی ادارہ جس کی بنیاد انسانوں کے اجتماع کے بجائے محض اقوام کا اجتماع ہو، کبھی خیر وسعادت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس کے نزدیک صحیح نصب العین جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم ہونا چاہیے ۔

تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم

اقبال نے اپنے کلام میں لادینی جمہوریت کی سخت مخالفت کی ہے جس کی بنا پر لوگوں نے اس پر فسطائیت کا الزام لگایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی مخالفت کا باعث جمہور دشمنی نہیں بلکہ جمہوریت دشمنی ہے۔ وہ عام لوگوں کی صلاحیت کا نہ منکر ہے اور نہ ان کو آزادیِ راے اور صحیح اختیارات دینے کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں ہر بنی آدم تکریم و عظمت کا حامل ہے۔ نیٹشے کے خیال میں عوام صحیح معنوں میں 'انام' ہیں اور اس لیے اس نے تمام اختیارات و حقوق ان سے لے کر فوق البشر کے سپرد کر دیے۔ ان کے لیے سواے تقلید اور پیروی کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ لیکن اقبال کے ذہن میں عوام سے متعلّق کوئی ایسا پست تخیل موجود نہیں۔ ''اسلامی جمہوریت ایک روحانی اصول ہے جس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ ہر انسان چند بالقوہ صفات کا حامل ہے جو ایک خاص قسم کی سیرت کی تشکیل سے بروے کار آسکتی ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جن لوگوں نے بہترین کارنامے پیش کیے وہ بھی عوام ہی تھے''۔ (دیباچہ اسرار خودی، انگریزی ترجمہ، ص ۱۹، لاہور ۱۹۵۰ء)

اقبال نے جب جمہوریت پر اعتراض کیا ہے تو اس سے اس کی مراد جمہوریت کی وہ شکل ہے، جو مغرب میں موجود ہے جس کی اساس وطن و قوم کے غلط تصور پر قائم ہے اور جس نے لوگوں کو اخلاق اور انسانیت کا پیغام دینے کے بجاے فتنہ و فساد، خون ریزی اور ہلاکت، استحصال اور لُوٹ مار کے بازار گرم کیے ہیں۔ یہ سرمایہ داروں کی جنگ زرگری ہے۔ قیصریت اور استبداد کا ایک پردہ ہے۔ اس 'شرابِ رنگ و بُو' کو اختیار کرنے سے سواے نامرادی کے اور کچھ حاصل نہیں:

فرنگ آئینِ جمہوری نہاد است رسن از گردنِ دیوے کشاد است
ز باغش کشتِ ویرانے نکوتر ز شہر او بیابانے نکوتر
گروہے را گروہے در کمین است خدایش یار اگر کارش چنین است

(فرنگ نے جمہوری آئین کی بنیاد رکھ کر دیو کی گردن کو زنجیر سے آزاد کر دیا ہے۔ اس کے باغ سے ویران کھیتی اور اس کے شہروں سے بیاباں بہتر ہیں۔ ہر گروہ دوسرے گروہ کی گھات میں ہے، اگر معاملہ یہی رہا، تو پھر ان سے بھلائی کی کوئی اُمید نہ رکھ)۔

جمہوریت کی حقیقی غلطی اقبال کے نزدیک یہ ہے کہ لادینی نقطۂ نگاہ کے زیراثر مغرب نے لوگوں کو ہر معاملے میں مطلق العنان بنادیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی مقصد ومطلب ہے تو صرف مادی منفعت نہ کہ انسانی بھلائی۔ صحیح روحانی جمہوریت وہ ہے جس میں اقتدار کا مآخذ عوام کے بجائے ذاتِ باری ہو ۔

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آزری

جاوید نامه میں اس سلسلے میں کہتے ہیں:

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود زور ور بر ناتواں قاہر شود
زیرِ گردوں آمری از قاہری است آمری از ماسوا اللہ کافری است

(جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس سے طاقت ور کمزور پر مسلط ہوجاتا ہے۔ روے زمین پر حکومت جبر سے قائم ہوتی ہے۔ اس لیے ماسوا اللہ کی حکومت کافری ہے)۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانوں کو اجتماعی طور پر کسی نظام کی ضرورت نہیں بلکہ صرف وہی نظام مملکت عدل و انصاف قائم کرسکتا ہے جس کی بنیاد اخلاقی اور روحانی اصولوں پر ہو۔ الحکم للّٰہ اور الملك للّٰہ۔ جب تک انسانی تمدن کی بنیاد عالم گیر روحانی اصولوں پر نہ رکھی جائے تب تک امن و عافیت ممکن نہیں۔ مغرب کی لادینی مادیت نے مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔ کبھی وہ جمہوری قبا میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی وہ اشتراکیت کی شکل میں جلوہ فگن ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب قدیم جاہلیّت ہی کی تازہ شکلیں ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسی روحانی ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے جس نے پہلے بھی اس جاہلیّت کے طلسم کو توڑا تھا ۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم
گزر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

(اقبال ریویو، لاہور، جولائی ۱۹۶۲ء تا جنوری ۱۹۶۳ء)۔ (انتخاب: اقبالیات کے سو سال، مرتبین: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر، ڈاکٹر وحید عشرت، ص ۴۷۱-۴۷۸)

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ

شفیق استاد، دل نواز مزکی، نظریہ شناس محقق

محمد عبداللہ جاوید

۳؍اکتوبر ۲۰۱۲ء کی شام نماز عصر سے پہلے بڑی دل خراش اطلاع ملی کہ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری انتقال فرما گئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، حسنات کو شرف قبولیت بخشے، جنت الفردوس عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔ آمین!

موصوف طویل قیام کے بعد ۱۸؍ستمبر کو امریکا سے علی گڑھ واپس آ گئے تھے۔ طبیعت ٹھیک ہی تھی البتہ پیروں میں درد کی شکایت تھی۔ ۳؍اکتوبر کو نماز ظہر ادا کی، دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد سینے میں درد کی شکایت کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درد نے شدت اختیار کر لی اور موصوف پلنگ پر لیٹے لمبی سانسیں لینے لگے۔ دواخانے لے جا رہے تھے کہ راستے ہی میں روح پرواز کر گئی۔ ۴؍اکتوبر کی صبح ۹:۳۰ بجے جامع مسجد، سرسید نگر، میں محترم امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری نے نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ اسی مسجد سے متصل شوکت منزل قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جس میں ذمہ داران مرکز، شہر کی بااثر شخصیات کے علاوہ اطراف کے مقامات سے رفقائے تحریک نے شرکت کی۔ ڈاکٹر عبدالحق انصاریؒ کے انتقال سے تحریک اسلامی کی علمی وفکری ضروریات کو پورا کرنے والی ایک نہایت ہی معتبر شخصیت اب ہمارے درمیان نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ اس کی تلافی فرمائے اور تحریک اسلامی کو ان کا نعم البدل عنایت کرے۔ آمین!

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، ۱۹۳۱ء کو تمکوہی، مشرقی یوپی میں پیدا ہوئے۔ موصوف علیم الدین انصاری مرحوم کے بڑے صاحب زادے تھے۔ ان کے علاوہ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے دو بھائیوں اور ایک بہن کا انتقال ہوا ہے۔ دو بھائی امریکا میں رہتے ہیں۔ ایک بھائی ان کے آبائی وطن میں ہیں اور ہمشیرہ کلکتہ میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ رابعہ ہیں۔ اور چار بیٹیاں عذرا، زہرہ، سلمیٰ، شیما، اور ایک بیٹا خالد ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں اسلامیہ کالج سے انٹر کیا۔ اسی دوران تحریک اسلامی سے متعارف ہوئے۔ پھر ندوۃ العلما سے عالمیت کا کورس کیا۔ مرکز کی جانب سے رام پور میں قائم درس گاہ اسلامی میں تین سال (۵۳-۱۹۵۱) تعلیم کے حصول میں صرف کیے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا صدرالدین اصلاحیؒ، مولانا عبدالسمیع قدوائیؒ، مولانا عبدالغفار ندویؒ، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ سے بی اے کیا اور ۱۹۵۹ء میں فلسفے میں ایم اے۔ ابن مسکویہ کے فلسفہ اخلاق (Ethical Philosophy of Mishkawi) پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ فراغت کے بعد شانتی نکیتن یونی ورسٹی، مغربی بنگال میں لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسی دوران مشہور مستشرق ولفریڈ کینٹ ول اسمتھ سے ملاقات ہوئی اور ان کی دعوت پر ۱۹۷۲ء میں آپ نے ہارورڈ یونی ورسٹی سے 'ماسٹرز ان تھیالوجی' کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کی تدریسی خدمات ملک اور بیرون ملک میں رہی ہیں۔ سعودی عرب اور سوڈان قابل ذکر ہیں۔ اس دوران آپ نے کئی زبانوں کو ضرورت کے لحاظ سے سیکھا، جرمن، فرنچ، سنسکرت، یونانی اور عبرانی۔ عربی، انگریزی اور ہندی زبانوں میں تو آپ کو دست رس حاصل تھی۔

موصوفؒ اپنے طالب علمی ہی کے زمانے سے جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، اور اپنے تعلیمی ارتقا کی طرح تحریکی سرگرمیوں کو بھی اسی نہج پر جاری رکھا۔ مغربی بنگال کے اس وقت کے امیر حلقہ جناب عبدالفتاحؒ سے بڑا خصوصی لگاؤ تھا۔ انھی کی ہدایت کے مطابق مختلف سرگرمیاں انجام دیتے۔ قریبی حلقوں، بہار اور یو پی کے بھی مختلف اجتماعات میں شرکت ہوتی۔

● **علمی خدمات:** ڈاکٹر صاحبؒ نے فلسفہ، اخلاق، تصوف، تزکیہ نفس، احیاے دین جیسے موضوعات کے علاوہ مختلف تحریکی ضروریات کے تحت کئی کتابیں اردو، انگریزی اور عربی زبانوں میں تصنیف فرمائی ہیں۔ مختلف یونی ورسٹیوں اور اداروں کے خصوصی مجلّوں کے لیے تحریریں تصنیف

کی ہیں۔ تحقیقی مقالہ جات بھی متنوع موضوعات پر تصنیف فرمائے ہیں، جن میں اسلامی فلسفہ اخلاق، تصوف، مذہبیات، مجددین اُمت اور صوفیاے کرام، ابن مسکویہ کے تصورات، تقابلی مطالعہ ادیان اور دعوت قابل ذکر ہیں۔ مختلف قومی اور بین الاقوامی سیمی ناروں اور مذاکروں میں شرکت کے ذریعے انھی موضوعات کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر فرمایا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحقؒ اصلاً ایک محقق تھے جنھوں نے صرف نری تحقیق پر انحصار نہیں کیا کہ کسی موضوع کی تہہ تک جا کر اس کی گتھیاں سلجھانے کی حد تک اپنے کام کو محدود رکھتے، بلکہ اپنی تحقیق کو مقصدیت سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی، اور یہی آپ کے علمی کارناموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اصل میں کسی فرد کے کارناموں کو ایک صحت مند نظریہ ہی تاریخی بنا سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ کے کارناموں کی آفاقیت کی وجہ ان کا صاف و شفاف نظریہ ہی تو ہے۔ اس لیے بجاطور پر ڈاکٹر عبدالحقؒ کو ایک نظریہ شناس محقق کہا جاسکتا ہے جن کے علمی و تحقیقی کارنامے، ان شاءاللہ تحریک اسلامی کی علمی ضروریات کی تکمیل کرتے رہیں گے۔ اس امر کی مزید صراحت مرحوم کی تصانیف کے جائزے سے ہوتی ہے۔

ایک ایسا ماحول جہاں زندگی کا مقصد واضح نہیں، اور اگر ہے بھی تو افراط وتفریط کا شکار، اس تناظر میں 'مقصد زندگی کا اسلامی تصور' کو موصوفؒ نے بڑے ہی توازن کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کو پڑھنے کے بعد کسی قسم کی الجھن باقی نہیں رہتی۔ تصوف میں غلو اور روحانیت کے غیر متوازن تصورات کے برعکس بڑے پُرزور انداز سے تصوف کے ان قابلِ تقلید پہلوؤں کو اُبھارا جو فی الواقع روحانی ضرورتوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ تصوف اور شریعت اس لحاظ سے ان کی ایک معرکہ آرا تصنیف قرار دی جاسکتی ہے جس میں بڑے ہی مدلل انداز سے اسلام مخالف پہلوؤں کی وضاحت بھی ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ اچھے پہلوؤں کو ابھارا بھی گیا ہے۔ ملت اسلامیہ اور بالخصوص جماعت اسلامی کے حلقوں میں جو روایتی انداز سے مصلحین امت کے سلسلے میں رائے قائم ہے، اور ان سے عقیدت و محبت کا جو تعلق ہے، اس تناظر میں مجددین امت کا مختلف پہلوؤں سے تعارف کرایا۔ امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وغیرھم سے متعلق انھوں نے بڑے ہی واضح انداز سے ان امور و مسائل کو بیان کیا ہے جس سے ملت میں ان حضرات سے معنوی استفادے کا ایک فطری جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ مجددین اُمت اور تصوف

اس موضوع پر ایک اہم اضافہ مانا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر آپ نے مجددین کی فہرست میں مولانا مودودیؒ کو بھی شامل کرلیا، اور افادات مودودیؒ اس ضمن میں ایک بامعنی تصنیف ہے۔ آپؒ کے نزدیک قریبی دور میں چار اہم مجددین قرار پائے۔ امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور مولانا مودودیؒ۔ نوجوانوں کی تربیت کے لیے ان چاروں مجددین کا تفصیلی مطالعہ کرایا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ ان کے افکار و خیالات کا مطالعہ، احیاے اسلام کے لیے کیا جانا چاہیے۔ کسی شخص کے افکار کو قطعی نہ سمجھنا چاہیے، جہاں کھٹک محسوس ہو، وہاں ٹھیر کر غور و فکر کرنا اور صحت مند تبادلۂ خیال کا ایک ماحول بنانا چاہیے۔ ہندستان جیسے تکثیری سماج میں قومی یک جہتی کا کیا مفہوم اور تقاضے ہیں، ان کی کتاب قومی یک جہتی اور اسلام، بخوبی واضح کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا امام ابن تیمیہؒ کا انتخاب بڑا بامعنی محسوس ہوتا ہے، جن کے معاشرت و سیاست سے متعلّق افکار و خیالات سے استفادے کے لیے آپ نے قابل قدر کوشش کی ہے۔

● **دعوت**: ڈاکٹر صاحبؒ ایک لمبی مدت تک بیرون ممالک میں رہے ہیں۔ ہندستان آنے کے بعد دعوتی ترجیحات کا جس انداز سے ذکر فرمایا کرتے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہاں کے حالات سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اپنے وطن واپس آنے کے بعد موصوف نے یہ جاننے اور سمجھنے کے لیے کہ دعوتی کام کن حلقوں میں کس نہج پر انجام پا رہا ہے، ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ انھوں نے بحیثیت امیر جماعت، دعوت دین کے سلسلے میں جو ترجیحات متعین فرمائیں وہ اسی کی غماز ہیں۔ دعوت دین پہنچانے کے معنی کیا ہیں اور اس میں کون کون سے کام اور مراحل شامل ہیں، بخوبی واضح کیا۔ موصوف چونکہ تقابل ادیان کے میدان سے بھی متعلّق رہے ہیں اس لیے وہ بطور خاص ہندومت اور عیسائیت سے متعلّق بتاتے جاتے کہ ان ان پہلوؤں سے اسلام کا مطالعہ اور کام ہونا چاہیے۔ ہندومت کے متعلّق بنیادی عقائد کی دعوت، غلط فہمیوں کا جواب، مذہب، زندگی بعد الموت وغیرہ کے سلسلے میں پائے جانے والے غلط تصورات کا ازالہ ان کا خاص ہدف تھا۔ عیسائیت سے متعلّق تصور تثلیث پر زیادہ زور دیا کرتے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کا ابن مریمؑ کی حیثیت سے ذکر کن حکمتوں سے کیا گیا اس کی وضاحت کرتے۔

تزکیۂ نفس سے متعلّق بنیادوں کی وضاحت کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ نے انسان کے حقیقی

تصور پر زور دیا ہے کہ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے حوالے سے فرماتے کہ علم اور خیر و شر کی تمیز سے انسان خلیفہ بنتا ہے۔ اس ضمن میں دوسرا اہم پہلو قرآنی اصولوں کی وضاحت تھا جس کے تحت وہ سورۂ حدید کی آیت ۱۰ کا ذکر فرماتے۔ اور تیسرا اہم پہلو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تزکیہ سے متعلّق تھا۔ آپ کے علمی کارناموں میں فارابیؒ، ابن تیمیہؒ، ابن مسکویہؒ اور طحاویؒ پر کام قابلِ قدر ہے۔ آپ کی انگریزی تصانیف میں بڑی گہرائی و گیرائی محسوس ہوتی ہے بہ نسبت اردو زبان میں لکھی گئی کتابوں کے۔ آپ کے مختلف مقالہ جات ملک کی نام وَر یونی ورسٹیوں کے علاوہ امریکا اور لندن کے معروف اداروں سے بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی کے ربع صدی کے تقریب کے موقع پر جو خصوصی مجلّہ شائع ہوا اس میں ڈاکٹر صاحبؒ کا مضمون Mysticism and Islam کو بڑا نمایاں مقام حاصل ہوا جس کو بعد میں مزید اضافے کے ساتھ شائع کیا گیا۔

● **اخلاق حسنہ:** ڈاکٹر صاحبؒ کو دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ذہنوں میں تازہ ہوتا تھا، اَلْمُؤْمِنَ غِرٌّ کَرِیْم، مومن شریف النفس اور بھولا بھالا ہوتا ہے۔ نرم مزاج، کم گو اور دھیمی انداز میں گفتگو کرنے والے۔ شخصیات سے متعلّق بڑے محتاط انداز سے گفتگو فرماتے۔ تحریکی ضرورتوں کا واضح شعور اور ان کی تکمیل کی پُرعزم کوشش، یہ اور اس طرح کی کئی خوبیوں سے آپ کی شخصیت منزہ تھی۔ کبھی غصہ بھی کرتے تھے۔ کسی کام کی تکمیل کے لیے زیادہ انتظار یا تاخیر پسند نہیں تھی۔ تحریک کے تقاضوں کو بیک وقت اڈریس کرنے کو پسند کرتے۔ جب وہ دیکھتے کہ کسی ایک ہی تقاضے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے تو وہ اپنے مخصوص انداز سے ناراضی کا اظہار فرماتے۔ ایسے وقت آپ کی باڈی لینگویج سے شخصیت کی جو نرم مزاجی ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی۔ تحریکی ضروریات کے تحت ہمیشہ افراد کی علمی وفکری تیاری پر زیادہ زور دیا کرتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی، گفتگو کا ایک مشترک امر تحریکی ضروریات ہوتا۔

آپ کی شخصیت میں روحانی پہلو بڑا نمایاں محسوس ہوتا تھا۔ علم اور عمل کا ایک حسین امتزاج تھے، اور یہی تاثر مرحوم کے دیرینہ رفقا کا بھی ہے۔ علم و عمل کے اس تال میل کا بعض معاملات میں ہم نے بھی مشاہدہ کیا ہے۔ جیسے اللہ سے گہرا تعلّق، جو مختلف اوقات میں ظاہر ہوتا تھا۔ راہِ خدا میں سرگرمی کا ذکر ہو تو خدا کی مدد کا دل نشین انداز سے ذکر فرماتے۔ علم و فہم کے لیے فضل ربانی کا بڑی اہمیّت سے

ذکر فرماتے۔ فرائض کی ادائیگی کے بعد بڑی دیر تک اپنی جگہ بیٹھے تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے۔

کسی اجتماع میں ڈاکٹر صاحبؒ کی آنکھوں میں کم ہی آنسو آتے تھے، لیکن جہاں تعلق باللہ سے متعلق کوئی واقعہ ہوتو آنکھیں فوری نم ہو جاتیں۔ دوران تعلیم حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے کا واقعہ ذکر کرتے تو آپ پر رقت طاری ہوجاتی، خصوصاً اس وقت جب یہ ذکر ہوتا کہ حضرت ابراہیمؑ آگ میں ہیں اور فرشتہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی تلقین کرتا ہے، تو آپؑ فرماتے ہیں کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح غار ثور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کہنا لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا، آپ کے اوپر اسی طرح کی کیفیت طاری کرتا۔ آپ کے علمی سفر کو دیکھ کر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس کے مطابق عمل ہی نے آپ کو ایک بلند مرتبہ عنایت فرمایا ہے۔ علمی وفکری ارتقا کے لیے لازم علم وعمل کا حسین امتزاج کیا ہی خوب راز ہے، جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واضح فرماتے ہیں: اَلْعِلْمُ اِمَامُ الْعَمَلِ وَالْعَمَلُ تَابِعُہٗ، علم عمل کا امام ہے اور عمل اس کا تابع۔

● **افراد کی تیاری کا منصوبہ:** تحریک اسلامی کی علمی وفکری برتری قائم رکھنے کے لیے نوجوانوں کی تیاری، آپ کے خاص کاموں میں سے ایک ہے۔ اس کے لیے عربی زبان، اسلامیات اور مختلف ادیان کے مطالعے پر مشتمل ایک جامع منصوبہ تیار کیا تھا، جس سے عصری علوم سے فارغ نوجوانوں کو گزارنا چاہتے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے اواخر میں سعودی عرب سے ہندستان آنے سے قبل ہی اس کے بعض اجزا پر کام شروع کیا تھا۔ جب ہندستان آمد ہوئی تو علی گڑھ میں مرکز برائے مذہبی تحقیقات و رہنمائی (Centre for Religious Studies and Guidance - CRSG) قائم کیا جس کا ہمیں طالب علم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران موصوف نے قرآن فہمی اور عربی زبان سے واقفیت کے لیے کوششیں شروع کردی تھیں۔ عربی زبان سکھانے کے لیے خصوصی اسباق مرتب کیے اور ان کے مطابق منتخب لوگوں کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اس تجربے کی بنیاد پر آپ نے Learning the Langauage of Quran کتاب تصنیف کی۔ اسی کے اسباق CRSG میں پڑھائے جاتے تھے۔ کبھی ڈاکٹر صاحبؒ خود پڑھاتے اور کبھی مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسروں کی خدمات لی جاتیں۔ عربی زبان کی تعلیم کے علاوہ نوجوانوں کی تیاری کے لیے آپ نے ہمہ جہت منصوبہ بنایا تھا جس کے تین حصے تھے۔ پہلا حصہ عربی زبان اور

ادب، تفاسیر قرآن، شروح احادیث وغیرہ پر مشتمل تھا۔ دوسرے حصّے میں اسلامیات، جس کے تحت بنیادی عقائد، جمع وتدوین قرآن، علم الحدیث، خلفاے راشدین وتابعین کی زندگیاں، معاشرت، معیشت، فلسفہ، سیاسیات، تاریخ، تصوف، فقہ، تحریکات اسلامی جیسے مضامین شامل تھے۔ تیسرا حصّہ مذہبیات پر مشتمل تھا جس کے تحت دنیا کے چھے بڑے مذاہب اسلام، ہندومت، عیسائیت، یہودیت، جین مت اور بدھ مت کے افکار، عقائد، کلچر، تہذیب وغیرہ کا تقابلی مطالعہ کرایا جاتا۔

● **استاد و مزکی**: ڈاکٹر عبدالحقؒ ہمارے استاد ومربی تھے۔ بڑی شفقت اور محبت سے انھوں نے تعلیم وتربیت دی اور تحریک اسلامی کے لیے زندگی وقف کرنے کا جذبہ پروان چڑھایا۔ استاد محترمؒ، قرآن وحدیث سے براہ راست استفادے کی صلاحیت پیدا کرنے پر بھرپور توجہ فرماتے تھے، اور کہتے تھے کہ اسلام کی نمایندگی کے لیے یہ لازمی ہے۔ انھوں نے کہیں سنا یا پڑھا تھا کہ مولانا مودودیؒ کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص چھے ماہ سنجیدہ کوشش کرے تو اتنی عربی سیکھ سکتا ہے کہ قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کرسکے۔ مولانا مودودیؒ کے اس قول کو پرکھنے کا انھوں نے مجھے ایک بہترین ذریعہ سمجھا۔ جس کا ذکر خود انھوں نے CRSG کورس کی تکمیل سے پہلے تحدیثِ نعمت کے طور پر کیا۔ کیونکہ میرے علاوہ بقیہ سات طلبہ عربی تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے۔

فوکس، علم کے حصول کے لیے یہ آپ کا ہم سب سے بڑا خاص مطالبہ تھا۔ اس کے لیے موصوف کبھی کبھی سنجیدگی کے الفاظ بھی کہا کرتے۔ صرف پڑھائی پر دھیان دینے کی تاکید کرتے۔ اگر کسی وجہ سے ٹیسٹ میں نمبر کم آتے تو فوری اپنے چیمبر میں طلب کرتے اور خوب ڈانٹتے۔ پھر وہی یکسوئی کی تلقین فرماتے۔ ادھر ادھر گھومنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ اور کہتے کہ ہم تمھیں تحریک کے لیے ہی تیار کررہے ہیں، کورس بڑا بھاری ہے، اس لیے ہر دن کو اہم سمجھو، پڑھائی پر دھیان دو۔ ہم تمام طلبہ کی خواہش تھی کہ پٹنہ میں منعقد ہونے والی اسلامک اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (ISO) کی پہلی نارتھ انڈیا کانفرنس (نومبر ۱۹۹۶ء) میں شریک ہوں لیکن موصوف نے منع فرمایا اور کہا کہ یہ وقت اپنے آپ کو تحریک کے لیے تیار کرنے کا ہے۔ فلاں فلاں مضامین باقی ہیں اور فلاں مقام سے فلاں صاحب پڑھانے آرہے ہیں۔ پڑھائی پر توجہ دو۔

کُل ہند تربیتی اجتماع منعقدہ چینئی (۲ تا ۴ جنوری ۲۰۱۲ء) میں منتظمین نے ہمارے قیام کا

انتظام استاد محترمؒ کے ساتھ فرمایا تھا۔ یہ قیام موصوف سے تفصیلی استفادے کا آخری موقع تھا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحبؒ کی طبیعت ناساز تھی۔ کمرے میں زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتے تھے۔ پیروں میں شدید درد رہتا، پاؤں دبانے کی خواہش ظاہر کی تو منع کرتے۔ اس دوران ویلفیئر پارٹی کے قیام، وابستگان جماعت کی تربیت، علمی وفکری برتری کے لیے ترجیحات کا تعین، اسلام کو ایک متبادل کی حیثیت سے پیش کرنے کے طریقوں پر گفتگو کا موقع ملتا رہا۔ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ان ثقیل موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کا موقع نہ مل سکا، البتہ جو بھی آپ سے سنا اس سے بڑی حد تک اطمینان ہوا۔ اس موقع پر موصوفؒ نے قرآن اور احادیث رسولؐ پر ہمارا جو کام ہوا ہے اس سے متعلق استفسار کیا، مسودہ دیکھ کر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا اور دعا دی۔ ان کا ایک خاص وصف نوجوان کی تربیت اور ان کی پیش رفت دیکھ کر انتہائی خوشی کا اظہار کرنا تھا۔ یہ موضوع انھیں اتنا عزیز تھا کہ اس کا ذکر جب ایس آئی او کے اجتماعات میں کرتے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ استاد محترمؒ کی نصیحتوں میں تین باتیں بڑی تکرار سے بیان ہوتی تھیں۔ انھی باتوں کو آپ نے بحیثیت امیر جماعت، تمام ہی وابستگان کے لیے مختلف اوقات میں بیان فرمایا: ۱- تعلق باللہ ۲- علمی وفکری برتری ۳- اخلاقی برتری۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدیؒ کے بعد ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ کا انتقال، تحریک اسلامی کی علمی وفکری برتری کے لیے مطلوب افراد کی شدید قلت کا تقاضا کر رہا ہے۔ ہمارے سابقین نے اپنے میدان میں مہارت حاصل کرتے ہوئے دین اسلام کی جس باوقار انداز سے، ملک اور بیرونِ ملک نمایندگی فرمائی، وہی اب تحریک اسلامی کی تیسری نسل کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔ بلاشبہہ تحریک اسلامی اپنے افکار کی گہرائی، اپنی حکمت عملی کی بالیدگی کے ذریعے جس تیزی سے وسعت اختیار کرتی جارہی ہے، 'جیالوں' کی ضرورت کا احساس کراتی ہے۔ ایسے لوگ جن کے لیے تحریک ایک جنون بن جائے۔ جن کے لیے تحریک سے وابستگی رات اور دن ان تھک جدوجہد کے ہم معنی ہوجائے۔ نصب العین کے واضح شعور سے سرشار اپنے مستقبل سے بڑھ کر تحریک کے مستقبل کی فکر کرنے والے ہوجائیں۔ استاد محترمؒ کی رحلت سے یہی سبق ملا کہ تحریک اسلامی سے والہانہ شغف ہو اور اپنی تمام تر صلاحیتوں سے اسے تقویت پہنچانے کی ہر دم فکر وکوشش۔ آج تحریک اسلامی جن حالات

میں اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہے اس کے لیے فضل الرحمٰن فریدیؒ اور عبدالحق انصاریؒ جیسے اپنے میدان کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ دونوں کی رحلت کے بعد تحریک میں اس بات پر سنجیدگی سے غوروفکر ہونا چاہیے کہ کس طرح مختلف سطحوں پر افراد کی تربیت کا نظم ہوسکتا ہے۔ اس کے بغیر تحریک کا اپنے مقصد کے حصول میں محسوس پیش رفت کرنا ممکن نہیں۔

● **نصرتِ دین ہی دنیا کا سب سے بڑا کام:** ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ کے اساتذہ میں مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کا نام نامی بڑا نمایاں ہے۔ موصوف ان کے طریقۂ تربیت پر روشنی ڈالا کرتے تھے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے بڑے پرزور انداز میں جو بات کہی ہم نے اس کا اثر ان کے شاگرد رشید کی زندگی میں نمایاں طور پر محسوس کیا ہے، یعنی دنیا میں نصرتِ دین سے بڑھ کر کوئی اور کام نہیں۔ انتقال کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ کا چہرہ بڑا مطمئن نظر آرہا تھا۔ چہرے کے آثار اسی طرح نمایاں محسوس ہورہے تھے، جس طرح کسی اہم کام کی تکمیل کے بعد آرام سے سوتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ بلاشبہہ موصوف نے ایک لمبی عمر پائی، آخیر دم تک کارخیر میں مصروف رہتے ہوئے اپنے دانا ہونے کا ثبوت دیا۔ تدفین کے بعد محترم امیر جماعت سید جلال الدین عمری نے گھر والوں کو صبر کی تلقین فرمائی، ڈاکٹر صاحبؒ سے اپنی جدائی کے صدمے کا اظہار فرمایا، تحریک کے لیے ان کے بے مثال کارناموں کا ذکر فرمایا۔ اس موقع پر رابعہ روتے روتے کہتی جارہی تھیں کہ ہاں، انھیں تو بس جماعت، جماعت، جماعت ہی کا کام عزیز تھا۔ یہ کہنے میں دکھ نہیں بلکہ رشک جھلک رہا تھا۔ افسوس نہیں بلکہ فخر اُجاگر ہورہا تھا۔ اللہ کی راہ میں سرگرم رہنے والوں کے لیے جو انعامات ملتے ہیں ان کے سلسلے میں ہمیں اکثر ڈاکٹر صاحبؒ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ کہہ کر تلقین فرمایا کرتے۔ آج، جب کہ موصوف ۸۱ سالہ جدوجہد کے بعد رب کریم سے ملاقات کے لیے رخصت ہوئے ہیں تو ان کی اہلیہ کے تاثرات اور مرحوم کے بھائی ظفرالحق کا کہنا کہ تمام بھائیوں کی نگاہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کی بڑی عزت تھی، اور سبھی انھیں ٹوٹ کر چاہتے تھے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کے خدمت گزاروں کے لیے ماحول کو سازگار بناتا ہے، اور لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کرتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاریؒ کو غریق رحمت فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہٗ وَاعْفُ عَنْہٗ وَادْخِلْہٗ فِی الْجَنَّۃِ - آمین یارب العالمین!

ایک مردِ بے باک۔ راجا محمد ظہیر خانؒ

عمران ظہور غازی

مرزا شوق نے کتنی سچّی بات کہی ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے　　　آج وہ کل ہماری باری ہے

موت ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ جو دنیا میں آیا وہ جانے ہی کے لیے آیا، کسی کو اس سے مفر نہیں۔ سابق امیر ضلع راولپنڈی، سابق ایم این اے، سابق رکن مرکزی مجلس شوریٰ راجا محمد ظہیر خان بھی اپنے رب سے کیے ہوئے وعدے کو وفا کر گئے۔ ۲/اکتوبر ۲۰۱۲ء کو وہ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے، انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

جماعت اسلامی ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کش مکش ان کا طرۂ امتیاز۔ ان کی ساری زندگی دعوت کے ابلاغ میں گزری۔ دعوتی خطوط کا خاص اہتمام کرتے۔ دعوتی کام کو جماعتی زندگی کی جان قرار دیتے۔ دعوت اور تربیت پر خصوصی توجہ دیتے۔ ایک مردِ درویش، جس کا ظاہر و باطن ایک تھا، جو خوش گفتار، خوش پوشاک اور خوش خوراک تھا۔ دعوتِ دین کے لیے ہمہ وقت مصروفِ کار اور سرگرم رہنے والا جفاکش آدمی تھا۔ اللہ نے ان کو بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا اور انھوں نے اپنی ان خوبیوں کو اللہ کے دین کی اقامت کے لیے خوب استعمال کیا۔ وہ نرم دم گفتگو گرم دم جستجو، پاک دل و پاک باز انسان تھے۔ حقیقت میں وہ بے چین روح تھے۔ ان کی شخصیت بے پناہ خوبیوں کا مرقع تھی، جن کو وہ اقامت دین کے لیے استعمال میں لاتے۔ ان کے مقاصد جلیل اور ادا دلفریب تھی۔ اقبال کے کتنے ہی اشعار ان پر راست آتے ہیں۔ جماعت میں آنے سے پہلے بلدیہ میں ملازم رہے۔ سینما دیکھنے کے شوقین تھے، مگر جب جماعت کا لٹریچر پڑھا اور جماعت میں آ گئے تو سینما کا منہ نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی کہتے تھے کہ ایک سینما دیکھنے

والا، آج امیر ضلع ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح کایا پلٹ ہوگی اور زندگی کا رنگ ڈھنگ بدل جائے گا۔ یہ خدا کی دین ہے جسے دے۔

انھوں نے اقامت دین کے اس راستے کی طرف قدم بڑھائے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مشکلات برداشت کیں، لاٹھیاں کھائیں، جیل گئے، مگر جو اس راستے پر چلنے کا عزم ایک مرتبہ کیا تو پھر پر تمام عمر ثابت قدمی، اُولوالعزمی اور استقامت کے ساتھ اس راستے پر چلتے رہے۔ ''وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے'' ان کا خاص وصف قرار پایا۔ سید مودودیؒ کے الفاظ میں 'مرجع خلائق' تھے، خلق خدا کی خدمت کرنے والے اور ان کے حقوق کے لیے لڑ جانے والے، مجلسی انسان تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا پسند کرتے، گپ شپ کرتے اور انھیں اپنا بنا لیتے۔ تحریکی گپ شپ ان کا خصوصی وصف تھا جس سے دل سوزی و رعنائی کا اظہار ہوتا۔ سید مودودیؒ کے ساتھ بھی ان کا قریبی تعلّق اور خصوصی رابطہ رہا۔ گوجر خاں سے ملاقات اور عصری مجالس میں شرکت کے لیے خاص طور پر لاہور آتے، اور سید سے براہ راست کسب فیض کرتے۔

راجا محمد ظہیر خان ۱۹۷۳ء میں جماعت کے رکن بنے۔ ۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ امیر ضلع اور ۸۸ میں پہلی مرتبہ ایم این اے منتخب ہوئے۔ امیر ضلع بنے تو راولپنڈی کا قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں چھان مارا۔ گوجر خان کے گردونواح میں پیدل، سائیکل اور گاڑی کے ذریعے ہر جگہ پہنچے۔ رات کو کہیں جگہ مل جاتی فبہا ورنہ مسجد میں قیام کرتے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ دو تین ساتھی مل کر صبح سویرے گاؤں سے نکل جاتے۔ کھیتوں، دکانوں، بازاروں اور گھروں میں ملاقاتیں کرتے۔ لٹریچر ان کے ساتھ ہوتا جسے تقسیم کرتے جاتے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ اس دوران اس قافلہ میں نئے ساتھی شامل ہوجاتے اور پرانے ساتھی واپس لوٹتے جاتے مگر راجا صاحب ہر قافلے اور وفد کے ساتھ ہوتے بلکہ اس کی جان ہوتے۔ دعوتی ملاقاتوں کے دوران رابطے میں آنے والوں کو دعوتی خطوط لکھتے، ذاتی رابطہ رکھتے۔ دعوتی ملاقاتوں کے دوران معاشرے کے چیدہ چیدہ اور مضبوط لوگ تلاش کرتے۔ نوجوان ان کا خاص ہدف ہوتے۔ محبت کا اظہار کرتے اور نوجوان ان کے ساتھ وابستہ ہوتے چلے جاتے۔ وہ ان کے ساتھ روابط رکھتے ان کو جماعت کی رکنیت کے مراحل طے کراتے۔ رکن بننے والوں سے خود آخری ملاقات کرتے۔ اسی طرح کارکنان کے ذاتی مسائل

ہوں یا خاندان کے دل چسپی لیتے، جماعتی مسائل کے ساتھ گھریلو اور ذاتی مسائل تک سے واقفیت حاصل کرتے، رہنمائی کرتے اور اس دوران گھر کے جن افراد سے رابطہ ہوتا ان کو بھی مسلسل اپنے رابطے میں رکھتے۔ مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب اور حوصلہ دلاتے۔ جوان کو ایک مرتبہ مل لیتا انھی کا ہو جاتا۔ مکمل توجہ اور انہماک سے ان کی بات سنتے۔ بچے اور بوڑھے اور جوان یکساں ان سے متاثر ہوتے اور ان کے ساتھ اپنائیت کا تعلّق محسوس کرتے۔ دل کی بات کرتے۔

انھوں نے اپنے دورِ امارت تحصیل گوجر خان کے زمانے میں اسلامی بستیاں بسانے اور قرآن وسنت کے مطابق بستیوں کا ماحول بنانے پر کام کا آغاز کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بستیوں کے رہنے والے اپنے ماحول کو اللہ کے دین کے رنگ میں رنگیں۔ اپنے ذاتی اور اجتماعی فیصلے قرآن وسنت کی روشنی میں کریں۔ زمین کے تنازعات ہوں یا عزیز واقارب اور رشتہ داروں کے گھر، گلی، محلّہ یا عدالت وتھانہ کے، ان کی کوشش تھی کہ یہ سارے مسائل ان اسلامی بستیوں میں جرگے کے ذریعے اسلامی شریعت کے مطابق حل ہوں اور اس کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔

وہ ضلع راولپنڈی کے ۱۰سال تک امیر رہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ضلع بھر میں دعوت کے کام کو خوب پھیلایا۔ ان کے نزدیک سید مودودیؒ کے لٹریچر کی تقسیم دعوت کا بہترین اور عمدہ ذریعہ تھا۔ اس کا خاص اہتمام کرتے۔ وہ ایم این اے منتخب ہونے کے بعد عوامی مسائل کے حل کے ساتھ دعوت کے ابلاغ کے لیے متحرک رہتے۔ لوگوں کے مادی مسائل کے ساتھ ساتھ وہ ان کے روحانی مسائل کے حل کے لیے بھی کوشاں رہتے۔ ایم این اے بنے تو اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی زمین فروخت کرتے رہے۔ لیکن ان کے ضمیر نے کبھی یہ گوارا نہ کیا تھا کہ وہ کمیشن کھائیں یا لقمۂ حرام سے فائدہ اٹھائیں۔ انھوں نے تنگی ترشی تو برداشت کی مگر رزق حلال کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا۔

بطور امیر ضلع نہایت شفیق اور مہربان انسان تھے۔ دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ بہت اچھے رہے۔ کبھی اُف تک نہیں کہا۔ نماز کے سخت پابند تھے۔ صبح سب سے پہلے مسجد میں پہنچتے۔ صحافیوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ معروف صحافی مختار حسن صاحب نے کسی موقع پر کہا کہ راجا صاحب امیر ضلع بنے تو ہم صحافیوں کو بھی جماعت کے دفتر آنے کا موقع ملا، ورنہ اس سے پہلے

جماعت کے دفتر کم ہی آنا ہوتا۔

وہ گفتگو بہت اچھی کرتے، قرآن و حدیث سے مزین، اشعار کا استعمال، دلسوزی، ان کی گفتگو کے خاص جوہر تھے جو صرف الفاظ کے پیکر نہیں تراشتے بلکہ ان کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ ایسے ہوتا تھا جیسے دل سے نکل رہا ہے۔ ان کی گفتگو اور عمل جذبۂ اخلاص سے معمور ہوتے۔ ضلع راولپنڈی اور اس کے گردونواح بالخصوص کشمیر تک میں درسِ قرآن اور خطاب کے لیے بلائے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شخصیت بھی وجیہہ عطا فرمائی تھی۔ اپنی شخصیت کو بھی وہ اقامت دین کے لیے استعمال میں لاتے۔ وہ اصلاً فنا فی التحریک تھے۔ خطہ پوٹھوہار سے تعلّق رکھنے والے راجا محمد ظہیر خان اس خطے میں تحریک اسلامی کی مضبوط اور توانا آواز تھے۔ وہ بہادر اور جری انسان تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا اور اس کے اظہار سے نہ چوکتے۔ چاہے اس کے لیے انھیں کتنی ہی قربانی دینا پڑے۔ جہاں ان کی شخصیت وجیہہ اور حسین و جمیل تھی وہیں وہ اچھے لباس کے بھی شائق تھے۔ ان کا لباس ان کے اعلیٰ ذوق کا آئینہ دار ہوتا۔ وہ خوش خوراک تھے اور کھانے کا بھی خوب ذوق رکھتے تھے لیکن اس ضمن میں خاص احتیاط کرتے۔ یہ اخراجات اپنی جیب سے کرتے اور اس کا خاص اہتمام کرتے، کہ ان اخراجات کا بار جماعت پر نہ پڑے۔ کھانے پینے کی اچھی اچھی دکانوں کا ان کو پتا ہوتا۔ ان کی اس نفاست کے چرچے قومی اسمبلی میں بھی رہے۔ اچھا کھاتے، خوب کھاتے اور کھانے کا حق ادا کرتے۔ شوریٰ کے اجلاسوں میں بھی ان کی رائے بہت نپی تلی ہوتی۔ ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ قرآن و حدیث کے مطالعے کے ساتھ اسلامی تحریک، اور دنیاے اسلام کے حوالے سے عمدہ معلومات ان کے پاس ہوتیں جن کو وہ اپنی گفتگو کا حصّہ بناتے۔

راجا محمد ظہیر رخصت ہوگئے ہیں۔ سید مودودیؒ کے چمن کے پھول، پرانے بادہ کشانِ محبت رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے فریضہ اقامت دین کی جدوجہد کو اختیار کیا تو اخلاص، مکمل آمادگی اور جذبہ صادق کے ساتھ۔ اور اپنی تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں اس راستے میں لگادیں اور پیچھے رہ جانے والوں کو منزل کی جانب مسلسل بڑھتے رہنے اور چلتے چلے جانے کا سراغ دے گئے۔ وہ اپنے حصّے کی شمع روشن کر گئے اور ہمیں یہ پیغام دے گئے ہیں کہ اب تمھیں روشنی کے اس سفر کو جاری رکھنا ہے۔


RCIB
www.riphah.edu.pk
اسلامی اقدار — بین الاقوامی معیار
کیا وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟
مگر نصیحت تو صرف عقلمند ہی لیتے ہیں۔ (القرآن (سورہ زمر، آیت ۹)
علم مومن کی میراث ہے اور ادیانِ عالم میں اسلام ہی وہ واحد دین حق ہے جس نے حصول علم کی اس قدر پرزور ترغیب دی۔
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام کے اسی سنہری اصول کو اپنی بنیاد بناتے ہوئے علم و حکمت کے بے مثال چراغ روشن کر رہی ہے اور حصول علم کے متلاشیوں کے لیے جدید ترین علوم کی تعلیم بین الاقوامی معیار کے مطابق فراہم کر رہی ہے۔ اگر آپ بھی اپنی صلاحیتوں کو نکھارنا، علمی و تحقیقی پیاس بجھانا اور شاندار کیریئر پانا چاہتے ہیں تو رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی کا حصہ بنیں۔
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی
آفس سیکٹر I-14، پشاور روڈ نزد حاجی کمپلیکس گولڑہ موڑ، اسلام آباد
یو-اے-این: 111-510-511 فون 7-051-5469641
274 پشاور روڈ، راولپنڈی
یو اے این: 111-510-510

شام: اسد خاندان کا مجرمانہ دورِ حکومت

انسانیت کے ماتھے پر بدنُما داغ

ارشاد الرحمٰن

اسلامی تاریخ کے قدیم کتابی ورثے میں 'بلادِشام' سے مراد موجودہ شام، لبنان، اُردن اور فلسطین کی سرزمین ہے۔ اس قطعۂ ارضی کو سرزمینِ انبیاؑ بھی کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج میں اس خطے کا ذکر زمینی گزرگاہ کے طور پر ہوا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت معراج رسولؐ کے اسی زمینی مرحلۂ سفر سے متعلق ہے۔ مسجد اقصیٰ کے گرد و پیش کی ساری زمین کو مفسرین نے اس آیت کی روشنی میں 'ارضِ مبارکہ' قرار دیا ہے۔ متعدد احادیث میں بلادِشام کے فضائل و مناقب بیان ہوئے ہیں۔ امام احمد اور ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شام کے لیے خوش خبری ہے؟ ہم نے عرض کیا: کس بنا پر یارسولؐ اللہ؟ آپؐ نے فرمایا: اس لیے کہ رحمٰن کے فرشتوں نے اس کے اُوپر اپنے پَروں کا سایہ کر رکھا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قطعۂ ارض کے لیے برکت کی دعا بھی فرمائی۔

اس فضیلت کے علاوہ صلیبی جنگوں میں اسلامی فتوحات کے شان دار سلسلے میں بھی شام کا ممتاز کردار رہا۔ شامی مجاہدین نے عماد الدین زنگی اور اُن کے بعد نورالدین محمود زنگی کی سپہ سالاری میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ پھر شامی اور مصری اتحاد نے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو صلیبی تسلط سے آزاد کرایا۔ اسی بنا پر بلادِ شام مغربی استعمار کا ہدف ٹھیرا اور اس نے

شام کی وحدت کو کئی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ خلافتِ عثمانیہ کے تحت اسے ایک صوبے کی حیثیت حاصل تھی۔ سائیکس پیکو معاہدے کی رُو سے چار مملکتوں میں بانٹ دیا گیا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی اس تقسیم کے مطابق شام، لبنان، اُردن اور فلسطین کی مملکتیں وجود میں آئیں۔

چھٹی صدی ہجری کے معروف تجدیدی عالمِ دین شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے تاتاری قوتوں کے خلاف اس علاقے کی جہادی سرگرمیوں کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ ان میں خود شریک ہوکر فریضۂ جہاد ادا کیا۔ یہ لشکرِ اسلام اس وقت تو اپنا وجود بچانے میں کامیاب ہوگیا مگر بیسویں صدی عیسوی میں وحدتِ مسلمہ کے انتشار نے صہیونی قوتوں کو یہاں پنپنے کا موقع فراہم کردیا۔ آج شام کی تحریک برائے تبدیلیِ نظام کی ناکامی اسرائیل کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اس لیے کہ اسرائیل شام اور مصر کے درمیان واقع ہونے کی بنا پر اپنے آپ کو خطرے میں سمجھتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ بلادِشام کی یہ ارضِ مبارکہ کئی عشروں سے خطے کے باسیوں کے لیے جہنّم بنی ہوئی ہے۔ قتل و غارت اور تباہی و بربادی کی جو تاریخ اِن علاقوں میں رقم ہوچکی ہے، تجزیہ نگاروں کے مطابق اس سے بدتر صورت حال کا مشاہدہ ممکن نہیں۔ مظالم کی داستانیں رقم کرنے والے انسان نُما ان وحشی حکمرانوں کو'انسانیت کے ماتھے پر بدنُما داغ' کہا جارہا ہے۔

آج سے ۴۲ برس قبل انسانیت کے ماتھے پر یہ بدنُما داغ اس وقت لگا تھا جب حافظ الاسد خاندان نے سرزمینِ شام کے آمرِ مطلق کے روپ میں نظامِ حکومت سنبھالا تھا۔ اسد کے اقتدار سنبھالنے سے لے کر آج تک شامی قوم مسلسل اس قصاب خاندان کے ہاتھوں ذبح ہورہی ہے۔ اسد کی حکمرانی اُس کی شخصی آمریت اور اکثریت پر علوی فرقے کا اقلیتی تسلط تھا، جسے عالمی ضمیر نے بھی قریباً نصف صدی سے ظلم وستم کی کھلی اجازت دے رکھی ہے۔ حافظ الاسد کو ملنے والے اقتدار کا آغاز گولان کے علاقے سے شام کی محرومی کی قیمت پر ہوا۔ اسرائیل سے اپنی شکست اور افواج کی پسپائی کا خودساختہ اعلان کرنے والے اُس وقت کے شامی وزیر دفاع حافظ الاسد کا یہ فیصلہ اُس کی ذات اور خاندان کے لیے شاہانہ زندگی کی ضمانت فراہم کرگیا۔ ۴۲ برس سے شام باپ بیٹے کی آمریت میں سلگ رہا ہے۔ باپ نے ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو اقتدار سنبھالنے کے بعد عوام کو طرح طرح کے تعذیب وتشدد اور قتل و غارت کے ذریعے اپنا محکوم بنائے رکھا۔ ۲۷ جون ۱۹۸۰ء میں تدمر کے

مقام پر قتلِ عام سے حافظ الاسد کے خونریز تاریخی سلسلے کا آغاز ہوا۔ پھر ۱۰مارچ ۱۹۸۰ء کو جسر الشغور کے مقام پر، ۵-۱۲/اپریل ۱۹۸۰ء کو حماۃ شہر میں، ۱۱/اگست ۱۹۸۰ء کی صبح عیدالفطر کے روز حلب شہر کے محلے المشارفہ میں قتل و غارت کا اعادہ کیا گیا۔ ۲فروری ۱۹۸۲ء کو تو حماۃ کے ایک بہت بڑے قتلِ عام کا تحفہ قوم کو دیا گیا۔ یہ قتل عام مسلسل ۲۰دن رہا اور اس میں ۳۰ سے ۴۰ ہزار نفوس نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ۱۵ہزار افراد لاپتا ہوگئے جن کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ایک لاکھ شہری اپنے گھروں سے ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیے گئے کیونکہ حماۃ کے ایک تہائی مکانوں کا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا تھا۔

۱۰/جون ۲۰۰۰ء کو بیسویں صدی کا یہ سفاک اور ظالم حکمران موت کے منہ میں چلا گیا۔ اس کا بیٹا بشارالاسد اس کی جانشینی میں صدرِ مملکت قرار پایا۔ گویا شام کا ملوکیت کے چنگل میں مستقل طور پر جھگڑتے رہنا اس کا مقدر ہے۔ شاید شامی قوم نے اکیسویں صدی کے 'عالمی انسانی حقوق' کے خوش نُما دور میں بھی اپنی تباہی و بربادی کا مزید رقص ابھی دیکھنا تھا، لہٰذا ۲۰۱۱ء میں عرب ممالک میں اُٹھنے والی بیداری کی لہر میں شامی قوم بھی شامل ہوگئی۔ باپ کی سفاکانہ تاریخ کو اگر بیٹا آگے نہ بڑھاتا تو جانشینی کا اہل ثابت کیسے ہوتا، لہٰذا وہ اسلحہ جو ۱۹۶۷ء میں گولان کے تنازعے پر اسرائیل کے خلاف استعمال ہونے کے بعد صرف اور صرف شامی قوم کی 'سرکشی' کو کچلنے کے علاوہ کبھی اور کہیں استعمال نہ ہوا تھا، دوبارہ اسی شامی قوم پر آزمایا گیا۔ بیٹے نے باپ کی تلخ یاد عوام کو دلا دی بلکہ اب تو قوم مظالم کے اُس سلسلے کی روح فرسائی کو ہلکا سمجھ رہی ہے جو باپ نے قائم کیا تھا۔ کیونکہ بیٹے نے اُس سے دس قدم آگے بڑھ کر قوم کو لاشوں، ہجرتوں اور در و دیوار کی مسماری و تباہی کا تحفہ دیا ہے۔

اخوان المسلمون مصر کے مرشد عام ڈاکٹر محمد بدیع کا کہنا ہے کہ شامی قوم پر فضائی اور زمینی ہر قسم کے حملے کیے جارہے ہیں۔ ٹینکوں، توپوں اور راکٹوں سے انسانوں کو تباہ کیا جارہا ہے۔ گھر مسمار کیے جارہے ہیں، عزتیں پامال کی جارہی ہیں اور جایدادیں لُوٹی جارہی ہیں۔ اس سے خوف ناک اور دل سوز منظر یہ ہے کہ بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ انسانوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا ہے، جو گرفتار ہوجائیں اُن کو بشار کی تصویر کو سجدہ کرنے اور کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر وہ انکار کریں تو بکروں کی طرح انھیں ذبح کر دیا جاتا ہے۔ شہادتوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ (اخوان آن لائن)

واشنگٹن پوسٹ کے ایک کالم میں کہا گیا ہے کہ حلب جو دنیا کا قدیم ترین شہر ہے

آ گ کے شعلوں میں جل رہا ہے۔ بشار کی افواج دشمن کے شہریوں کو نہیں بلکہ شامی قوم کو قتل کر رہی ہیں جو حیرت انگیز ہے۔ تجزیے میں کہا گیا ہے کہ بشارالاسد جس وحشیانہ طریقے سے شام کے شہروں میں تباہی و بربادی عام کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کو دوبارہ اس حالت میں لایا نہیں جا سکے گا۔

الشرق الاوسط کے مدیرِاعلیٰ طارق الحمید نے لکھا ہے کہ ''شام میں قتل و غارت اور تباہی و خونریزی کا سلسلہ بد سے بدترین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ عالمی طاقتیں اپنے نقطۂ نظر میں متفق نہیں ہیں، بلکہ یہ کہا جانا چاہیے کہ سب کچھ واضح ہے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ بشار انتظامیہ قتل کے راستے پر چل رہی ہے، جب کہ قوم اُس کے خلاف تبدیلی کے لیے بپھری ہوئی ہے، اور ادھر بشار انتظامیہ روس، ایران اور حزب اللہ سے مدد لے رہی ہے مگر کس کے لیے؟ بے یار و مددگار اور تنہا شامی قوم کو تباہ کرنے کے لیے۔ (۹/اکتوبر ۲۰۱۲ء)

الجزیرہ نیٹ کے ایک تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ کسی کو توقع نہیں تھی کہ شام کی صورت حال اس قدر خراب ہو جائے گی اور اسلحہ ہی فیصلہ کن قوت بن جائے گا۔ ہر آواز جنگ کی آواز میں دب جائے گی، حُریت و حقوق کے علَم بردارِ سیاست اسلحہ اُٹھانے پر مجبُور ہو جائیں گے۔ عوامی مزاحمت کے عسکریت پسندی کی طرف جانے کی وجوہات یہ ہیں کہ جب مظاہرین اپنے مطالبات سے پیچھے ہٹتے دکھائی نہ دیے تو حکومت نے انھیں اسلحے کے زور سے کچلنے کی کوشش کی۔ اسلحے کا یہ استعمال یقینی بات ہے کہ فوج اور پولیس ہی کو کرنا تھا، لہٰذا فوج اور پولیس کی کثیر تعداد نے اپنی ہی قوم اور اپنے ہی خاندانوں پر اسلحہ چلانے سے انکار کر دیا اور اس جنگ میں فوج کی شرکت پر اعتراض کیا۔ جب یہ لوگ حکومت کی رُخصتی کے واحد نکتے پر متفق ہو گئے تو عوام اور قوم کے ساتھ مل گئے۔ ادھر 'آزاد لشکر' یعنی عوامی لشکر اپنے بڑے بڑے گروپ تشکیل دے کر مظاہروں کا اہتمام کر رہے تھے جن کے ساتھ وہ لوگ ملتے گئے جنھیں اپنے گھربار اور اہل و عیال کے دفاع کی فکر تھی۔ اس کے ساتھ تیسری قوت اُن افراد کی شامل ہوگئی جو تشدد پسند مذہبی انقلابی رجحان رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی شمولیت کے باعث حکومت کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چوتھی طاقت اس تحریک میں اُن لوگوں کی شامل ہوگئی جو جیلوں سے رہا ہوئے تھے یا جو جرائم پیشہ عناصر تھے۔ ان قیدیوں کو حکومت نے تحریکِ بیداری کے آغاز میں رہا کیا تھا۔ اس عوامی قوت میں بعض کمزور دل اور

مُردہ ضمیر لوگ جب شریک ہوگئے تو لُوٹ مار اور چوری، ڈکیتی کی وارداتوں کا سلسلہ بھی بڑھ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ بشار حکومت نے تحریکِ مزاحمت کا رُخ خود مسلح جدوجہد کی طرف موڑا ہے مگر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ 'جیش حر' (آزاد لشکر) اُس کے گلے کی پھانس بن جائے گا اور انتظامیہ کی تمام تر قوتوں کو بھی اس معرکے میں جھونک کر کامیابی کی اُمید دکھائی نہیں دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بشاری قوتیں شہریوں کو اجتماعی تشدد و تعذیب کے ذریعے انھیں آزاد لشکر سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ (الجزیرہ نیٹ، ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۲ء)

الشرق الاوسط کی ایک رپورٹ سوریا: 'جمهورية الخوف' (شام: خوف کی ریاست) میں حافظ الاسد خاندان کے حکومتی تسلط کے جاری رہنے کی ایک وجہ اُس کے جاسوسی نظام کو بتایا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق بشار انتظامیہ میں شامل افراد نے پورے ملک میں مخبری اور جاسوسی کا ایسا نظام قائم کر رکھا تھا کہ ہر شخص اپنے ساتھ رہنے اور کام کرنے والے آدمی پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ یہی سمجھتا تھا کہ شاید یہ حکومتی ایجنسیوں کے لیے مخبری کرتا ہو۔ اس مقصد کے لیے بے روزگار نوجوانوں اور معاشی طور پر زبوں حال خاندانوں کے افراد استعمال ہوتے رہے۔ رپورٹ میں کئی فرضی ناموں سے اُن افراد کی گواہیاں پیش کی گئی ہیں جو اس نیٹ ورک کے لیے کام کرتے رہے۔

صرف حکومتی ایجنسیاں ہی یہ کام نہیں کرتی رہیں بلکہ بعث پارٹی کا ہر کارکن یہ دھندہ کرتا رہا اور معصوم و مجبُور لوگوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا۔ مخبری کا یہ نظام اس قدر وسیع تھا کہ یہ جملہ زبان زدعام عوام تھا کہ ''احتیاط سے بات کرو، دیواروں کے بھی کان ہیں''۔

بتایا گیا کہ بشار الاسد کا بھائی جنرل ماہر الاسد فوج کے اندر بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔ مخبرین کا ایک گروہ اس کی حرکات و سکنات نوٹ کرنے کے لیے بھی کام کرتا ہے کہ کہیں وہ 'الدنیا چینل' تو نہیں دیکھتا جس میں حکومتی طرزِ عمل پر تنقید کی جاتی ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ کہیں ماہر الاسد عوام کے ساتھ نہ جا ملے۔ جب صورت حال اس قدر بے اعتمادی اور خود غرضی کی حدوں کو چھونے لگے تو وہاں عوام کے خون، عزت و آبرو اور حقوق کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ عوام تو عوامی مقامات، ہوٹلوں، قہوہ خانوں، گلیوں، بازاروں میں بات کرتے ہوئے بھی سو بار سوچتے ہیں کہ جس آدمی سے بات کی جارہی ہے یہ بعثی جاسوس تو نہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ تحریکِ مزاحمت کے مسلح رُخ

اختیار کر جانے میں اس نظامِ جاسوسی کا خاصا دخل ہے۔ جاسوسی نظام نے ہر اُس شہری کو مشکوک سمجھا جو واقعتاً حکومت کے خلاف سرگرم نہیں تھا مگر انتظامیہ کے بے جا تشدد اور اذیت رسانی نے اسے 'جیشِ حُر' کے ساتھ جاملنے پر مجبور کیا۔ (الشرق الاوسط، ۲۸ستمبر۲۰۱۲ء)

ہفت روزہ المجتمع نے شام کی اس داخلی جنگ کے متاثرین میں سے چند خواتین کے تاثرات اور اُن کی الم ناک روداد شائع کی ہے۔ یہ خواتین شام کے ہمسایہ ممالک اُردن، ترکی، لبنان، الجزائر اور عراق کی سرحدوں پر موجود مہاجر کیمپوں میں ناقابلِ بیان حالات میں سانس لے رہی ہیں۔ مختلف اندازوں کے مطابق شام کی اس اندرونی جنگ کے باعث اپنے گھربار چھوڑ کر محض اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچانے کی خاطر ۱۰لاکھ سے زائد لوگ ہجرت کر چکے ہیں۔ یقیناً ہمسایہ ممالک کا اتنی بڑی تعداد میں مہاجرین کو قبول کرنے اور انھیں سنبھالنے کا مسئلہ معمولی نہیں ہے۔ پھر ان کیمپوں کے اندر مہاجرین کو ضروریات فراہم کرنے کا کام بھی آسان نہیں۔

اُردن کے صحرا میں زعتری، ذنبیہ اور رمثا کیمپوں میں موجود مہاجر خواتین سے المجتمع کے نمایندے نے صورت حال کے بارے میں پوچھا تو بتایا گیا کہ بنیادی انسانی ضروریات بھی یہاں فراہم نہیں ہو رہی ہیں۔ ایک خاتون نے بتایا کہ میں اپنے شیرخوار بچے کے لیے تین دن سے دودھ کے ایک پیکٹ کے لیے گھوم رہی ہوں مگر مجھے وہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ خواتین سے خوف و ہراس کی اس صورت حال میں ان سرحدوں کی طرف فرار کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ کوئی معمول کا سفر نہیں تھا۔ ہم پیدل چل کر ۱۰روز کے بعد یہاں پہنچی ہیں۔ خواتین کے یہ چھوٹے چھوٹے گروپ اپنی بچیوں بچوں کے ساتھ شام کے بڑے شہروں حمص، حماۃ، درعا، حلب وغیرہ سے جان بچا کر بھاگے اور اب ہمسایہ مالک کی سرحدوں پر یا اپنے ہی ملک کے اندر موجود کیمپوں میں بے بسی کے لمحات گزار رہی ہیں۔ سفر کی صعوبتوں کے ساتھ اب کیمپوں کے اندر ناکافی ضروریات نے ان پناہ گزینوں کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ وہ خواتین جو ہمسایہ ممالک میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئیں اُن کے مسائل اور مصائب کو کسی حد تک کم کرنے کی سماجی کوششیں جارہی ہیں۔

ترکی اس اعتبار سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے کہ اُس کی سرحدی آبادی کے شام کے گرد قبائل کے ساتھ رشتہ داری کے مراسم ہیں، اور بہت بڑی تعداد اس سرحد پر موجود ہے۔ ترکی

اپنی کوشش کر رہا ہے کہ مہاجرین کے مسائل بھی حل کیے جائیں اور جلد سے جلد شامی صورت حال معمول پر لائی جائے، مگر بدقسمتی سے ترکی کو اس اندرونی جنگ میں گھسیٹنے کی پوری کوشش ہو رہی ہے، بلکہ اسے ترکی کے خلاف جنگ کا بہانہ بنا کر بشار انتظامیہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش میں ہے۔ شام کو اسلحہ و بارود سپلائی کرنے والے طیارے کو جب ترکی نے اپنی سرحدوں میں داخل ہونے پر اُتار لیا تو معلوم ہوا کہ روس کی طرف سے یہ اسلحہ بشار انتظامیہ کی مدد اور شامی قوم کی تباہی کے لیے جا رہا تھا۔

حکومت کی تبدیلی کے لیے شروع ہونے والی تحریک عوامی مظاہروں سے جنگی کارروائیوں کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق بشار انتظامیہ روس و ایران سے کمک لے رہے ہیں، اور عوامی مزاحمت عسکریت کے ذریعے اُس کا جواب دے رہی ہے۔ شام کے دُور دراز علاقوں میں بسنے والے کاشت کار بھی اس تحریک میں شامل ہوکر اپنا 'فرض' ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بشار انتظامیہ ملک کے بڑے شہروں کے بیش تر حصوں پر اپنی گرفت قائم رکھنے میں ناکام ہوچکی ہے۔ حمص، حماۃ، حلب، درعا، وہ شہر ہیں جہاں بشار کا زور ٹوٹ چکا ہے مگر حالات مکمل طور پر 'جیش حُر' کے قابو میں بھی نہیں آسکے۔

الشرق الاوسط کے تجزیہ نگار عبدالرحمٰن الراشد کے مطابق: ''دارالحکومت دمشق کے بجائے حلب کا فتح ہونا عوامی مزاحمت کی کامیابی اور بشار کی ناکامی کا حتمی اعلان ہوگا۔ حلب انسانی تاریخ کا قدیم ترین شہر ہے۔ اس کی عمر ۱۰ ہزار سال کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ دنیا کی ہر شہنشاہیت کا یہاں سے گزر ہوا اور اس شہر کی خاطر اُس نے جنگ لڑی۔ دنیا کی آخری سلطنت خلافتِ عثمانیہ نے آستانہ و قاہرہ کے بعد اسے اپنا تیسرا 'دارالخلافہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں متحارب گروپوں کا زیادہ زور حلب کے اندر صَرف ہو رہا ہے۔

دمشق کی صورت حال حلب کی نسبت مختلف ہے۔ یہ دارالحکومت ہونے کی بنا پر ہر طرح کے دفاعی حصار میں محفوظ ہے۔ تاہم کارروائیاں تو یہاں بھی جاری ہیں مگر یہ وقفے وقفے اور بڑی تکنیکی منصوبہ بندی کے بعد ممکن ہوتی ہیں۔ یہاں زیادہ تر کارروائیاں گوریلا ہوتی ہیں۔ ان کارروائیوں پر قابو پانا انتظامیہ کے لیے نسبتاً آسان ہے۔ دمشق کے مشکل ہدف ہونے کی بنا پر جیش حُر کا زیادہ ارتکاز حلب پر ہے۔ اگست میں حلب عوامی مزاحمت کے کنٹرول میں آنے ہی والا تھا کہ روس اور

ایران کی بہت بڑی مدد نے اسے ناممکن بنا دیا۔ ۱۹۵۳ء کے عسکری انتفاضہ میں بھی جب سقوطِ حلب عمل میں آیا تو پھر جلد ہی دیگر شہر جبل الدروز اور حمص بھی انتظامیہ گرفت سے آزاد ہو گئے۔ حلب کا سقوط خوں ریز معرکے، مزاحمت کاروں کی مردانہ وار جرأت مندی اور زخمی اہلِ شہر کے صبر کے ساتھ ہی ممکن ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ انتظامیہ فوراً بے بس ہو جائے تو یہ حلب کے سقوط کے ذریعے ہی ممکن ہے، کیونکہ یہ شام کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کے سقوط کے بعد ہی روس اور ایران شام کے قصاب، بشارالاسد کی پشت پناہی سے ہاتھ روکنے پر مجبور ہوں گے"۔ (الشرق الاوسط، ۲۹ ستمبر ۲۰۱۲ء)

ان حالات میں اخوان المسلمون مصر کے مرشدِ عام ڈاکٹر محمد بدیع نے شامی عوام کی مزاحمت کو عزیمت و استقامت اور قربانی کا معرکہ کہا ہے۔ عالمِ اسلام سے شامی قوم کی مادی و اخلاقی مدد کی اپیل کی ہے۔ انھوں نے کہا: اگرچہ حالات بہت دگرگوں ہیں، سازشیں خوف ناک اور پے در پے ہیں، اور قربانی و شہادت کی مثالیں دلدوز اور اَلم ناک ہیں لیکن غلبہ قانونِ الٰہی کو ہی حاصل ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کو اُلٹا نہیں چلایا جاسکتا۔ بے گناہ اور پاکیزہ خون رائیگاں نہیں جائے گا، بلکہ یہ عن قریب نصیب ہونے والی فتح کی بہت بڑی قیمت ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ پوری شامی قوم خالص اور مخلص ہو کر اللہ کی طرف رجوع کر چکی ہے اور رنجیدہ دلوں کی گہرائیوں سے اُٹھنے والی یہ سچّی آواز ہم سن رہے ہیں: یَااَللّٰہ مَا لَنَا غَیْرُکَ یَا اَللّٰہ (اللہ تیرے سوا ہمارا کوئی نہیں، اے اللہ!)۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ سچّی آہ و زاری اللہ کی رحمت، تائید اور نصرت کے حصول میں کامیاب ہو کر رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فرمایا ہے: "اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے: "ہمارا رب اللہ ہے"۔ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اُس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔ (الحج ۲۲:۳۹-۴۱)

اخبارِ اُمت

خودمختار بنگسامورو: نئی اسلامی ریاست کا قیام!

محمد ایوب منیر

جنوبی فلپائن کے مورو مسلمان برس ہا برس کی قربانیوں کے بعد وسیع تر خودمختاری کی منزل کے حصول میں سرخرو ہو چکے ہیں۔ حکومتِ فلپائن اور مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے درمیان گذشتہ ۱۶ برس سے جاری مذاکرات نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ وسط اکتوبر میں طے پانے والے معاہدے سے جزائر منڈاناؤ، سولو کے مسلمان نہ صرف خودمختاری حاصل کرلیں گے بلکہ ۲۰۱۵ء میں ایک آزاد مسلم ریاست بھی وجود میں آجائے گی جس پر رومن کیتھولک فلپائن کی حکومت کو کسی طرح کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ بنگسامورو مسلمانوں کی زندگی میں یہ معاہدہ ایک اہم تاریخی دستاویز اور سنگِ میل کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

اس معاہدے کو 'فریم ورک معاہدہ برائے حتمی قیامِ امن' کا نام دیا گیا ہے۔ اس وسیع تر خودمختاری کے حصول کے بعد مسلح جنگ جو منیلا حکومت کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں بند کردیں گے۔ اندازہ یہ ہے کہ آزادی کی منزل اور مسلم ریاست کے قیام کی جدوجہد میں ڈیڑھ لاکھ مورو مسلمان جامِ شہادت نوش کرچکے ہیں۔ بنگسامورو وطن کا تنازعہ ایشیا کے قدیم اور پیچیدہ تنازعات میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ نئے عالمی نظام کے علَم برداروں نے صرف اپنے موضوعات اس قدر اُچھالے ہیں کہ مسلمانوں کے مسائل پس منظر ہی میں رہتے ہیں۔ تاہم اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، حکومت امریکا و روس اور اسلامی ممالک نے اس معاہدے کا اس لیے خیرمقدم کیا ہے کہ اس سے نہ صرف ایشیا میں امن قائم ہوگا بلکہ فلپائن کی حکومت بھی اپنے عوام کے لیے دائمی امن وسکون

کے قیام کو یقینی بنا سکتی ہے۔ مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے ۱۲ ہزار مسلح مجاہدین سروں پر کفن باندھ کر میدانِ عمل میں ڈٹے رہے اور گذشتہ ۵۰ برس میں منڈاناؤ، سولو، سلاوان کے مسلمانوں نے جس قسم کے اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی بائیکاٹ کا سامنا کیا ہے اور نسل در نسل جس قدر قربانیاں دی ہیں وہ ایک الگ تاریخ ہے جس کو مرتب کیا جانا چاہیے۔

۱۵؍اکتوبر ۲۰۱۲ء کو اس معاہدے پر دستخط ہو چکے ہیں۔ مورو اسلامک لبریشن فرنٹ (جو عرصۂ دراز سے آزاد اسلامی حکومت کے قیام کے لیے سیاسی و مسلح جدوجہد کر رہی ہے) کے مصالحت کار مہا گر اقبال اور حکومت فلپائن کے مصالحت کار ماروک لیونن نے منیلا کے صدارتی محل میں اس تاریخی دستاویز پر دستخط کیے۔ فلپائن کے صدر بینگنیو اکینوسوم، ملایشیا کے وزیر اعظم نجیب رزّاق اور مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے پُرعزم مجاہد قائد حاجی مراد دستخطوں کی تقریب میں موجود تھے۔ فرنٹ کے سربراہ اور حکومتِ فلپائن نے ملایشیا کی حکومت کا خصوصی شکریہ ادا کیا ہے جنھوں نے اس دیرپا مسئلے کے حل کے لیے مصالحت کار نامزد کیے اور ۱۶ برس کی محنت آخر کار رنگ لے آئی۔

یہ وسیع تر حقوق اور وسیع تر خودمختاری کا معاہدہ ہے۔ او آئی سی کو میانمار (برما) میں روہنگیا مسلمانوں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لیے دفتر کھولنے کی اجازت نہ مل سکی، تاہم اُس کے سیکرٹری جنرل نے بھی جنوبی فلپائن میں بنگسا مورو کی ریاست کے قیام کا خیرمقدم کیا۔ اس معاہدے کو رُوبہ عمل لانے کے لیے حکومت، فوج، پولیس، بنک، بلدیہ، ایکسچینج اور دیگر اہم اداروں کی تشکیل کے لیے درجنوں کمیشن تشکیل دے دیے گئے ہیں جس میں دونوں جانب سے نامزد نمایندے شامل کر دیے گئے ہیں۔ جس وقت دستخط کی تقریب منعقد ہو رہی تھی اُسی وقت ہزاروں مورو مسلمان اپنے قصبوں، شہروں اور دیہاتوں میں نعرۂ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ خواتین نے بڑے بڑے جلوسوں کی صورت میں اپنی مسرت اور استعمار سے نجات کے آغاز کا خیرمقدم کیا اور میڈیا میں اسے شہ سرخیوں کے ساتھ جگہ دی گئی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کئی ایسے نکات ہیں جن پر فریقین میں اختلاف ہوسکتا ہے، تاہم مجموعی طور پر قابض فلپائن اور زیرتسلط مورو مسلمان کی حتمی آزادی کے لیے ٹھوس اقدامات تجویز کیے گئے ہیں۔

وسیع تر خودمختاری کی حامل ریاست کا نام بنگسا مورو [مورو مسلمانوں کا گھر] ہوگا۔ ۱۳ صفحات پر مشتمل دستاویز میں واضح طور پر تحریر کیا گیا ہے کہ مسلح مورو مجاہدین بتدریج مسلم پولیس فورس میں

مدغم ہوجائیں گے۔ ۱۵؍افراد پر مشتمل عبوری کمیشن تشکیل دیا جائے گا جو دستور تشکیل دے گا۔

مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے سربراہ حاجی مُراد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ زیرتسلط مورو مسلمانوں کی اَن گنت قربانیاں رنگ لائی ہیں۔ مورو مسلمان اپنے وطن، اپنی شناخت، اپنے دستور اور اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں گے۔ تمام مسلح، نیم مسلح دستے، تعمیرِنو کی جدوجہد میں شریک ہوجائیں گے۔ اس نئی خودمختار ریاست میں پانچ صوبے شامل ہیں۔ باسلان، کوٹاباٹو، دواوَڈیل سور، سلطان قدرت، تاوی، سولو، واوی، ڈیولوگ اور دیتیان کے علاقے ان پانچ صوبوں میں شامل ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں حکومتِ فلپائن نے مورو لبریشن فرنٹ سے معاہدے کے بعد اس علاقے کو خودمختار قرار دینے کا اعلان کیا تھا، بوجوہ اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ ۲۰۰۸ء میں ہونے والا ایک اور معاہدہ بھی مسلمانانِ بنگسا مورو کے لیے نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکا تھا۔

مورو لبریشن فرنٹ کا، جو گذشتہ برسوں میں حکومت سے معاہدے کرتا رہا ہے، کہنا ہے کہ حکومتِ فلپائن پر شدید دباؤ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے ورنہ فلپائن کی حکومت کسی وقت بھی پینترا بدل سکتی ہے۔ ابھی خودمختار ریاست کا اعلان ہوا ہے اور مغربی طاقتوں نے وہاں القاعدہ ایجنٹوں کی موجودگی کا تذکرہ شروع کردیا ہے۔ یاد رہے دونوں بڑی تنظیموں میں داخلی اختلافات کے باوجود خلافتِ راشدہ کی طرز پر ریاست کے قیام پر کوئی اختلاف نہیں۔

مسلمان یہاں سیکڑوں برس سے آباد ہیں اور ۱۵۷۰ء میں اس علاقے پر پُرتگیزیوں نے قبضہ کیا تھا۔ یہ علاقے قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں اور ہمسایہ ملک ملایشیا کی طرح یہاں کے مسلمان بھی اسلامی روایات پر نسل در نسل عمل پیرا چلے آرہے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ یہاں جلد ہی ایسی حکومت قائم ہوجائے گی جو دین اسلام کے حقیقی نفاذ کا عزم رکھتی ہے۔ مورو اسلامک فرنٹ کے اوّلین چیئرمین اُستاذ سلامات ہاشم کے عالمی اسلامی تحریکات سے گہرے مراسم تھے۔ سابق امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد مرحوم کی دعوت پر وہ کئی بار پاکستان تشریف لائے تھے۔

سونے، چاندی، تانبے، زرخیز زرعی زمین، چاول، کپاس، گنا، گوشت اور سیکڑوں میل پھیلی ہوئی سمندری پٹی کے ساتھ بے حدوحساب مچھلی وسمندری خوراک کی دستیابی اس سے ملک کی معیشت کو مستحکم کرنے اور آزادی کے ساتھ تعمیروترقی کی راہ طے کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

سیّد مودودیؒ پڑھیے .... سیّد مودودیؒ پڑھائیے

کتابچہ	پرانی قیمت	رعائتی قیمت	کتابچہ	پرانی قیمت	رعائتی قیمت
اسلام کیا ہے؟	10 روپے	7 روپے	راہ خدا میں جہاد	12 روپے	8 روپے
اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب	10 روپے	5 روپے	شہادتِ امام حسینؓ		5 روپے
انسان کے بنیادی حقوق	24 روپے	7 روپے	سلامتی کا راستہ	20 روپے	7 روپے
جماعت اسلامی کے لائحہ عمل کے چار نکات		5 روپے	سوچنے کی بات	10 روپے	5 روپے
بناؤ اور بگاڑ	24 روپے	7 روپے	شہادت حق	15 روپے	8 روپے
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	36 روپے	15 روپے	طاقت کا سرچشمہ	10 روپے	5 روپے
جماعت اسلامی کی دعوت	20 روپے	7 روپے	کرنے کا کام	12 روپے	5 روپے
جماعت اسلامی کے 29 سال	36 روپے	15 روپے	کلمہ طیبہ کا پیغام	7 روپے	5 روپے
حزب اللہ کیلئے مطلوبہ اوصاف	7 روپے	5 روپے	مثالی تحریکی کارکن	12 روپے	5 روپے
حکومت بھلائی یا برائی کا سرچشمہ	10 روپے	5 روپے	نیکی کی دعوت	10 روپے	5 روپے
درود انؐ پر سلام انؐ پر	12 روپے	5 روپے	ہدایات	24 روپے	10 روپے
ذکر رسول ﷺ	12 روپے	5 روپے	دعوت اسلامی کے تین نکات	15 روپے	5 روپے

رسائل و مسائل

ماں کا بچوں سے امتیازی رویہ

سوال: والدین کو کسی ایک بچے کی طرف میلان رکھتے ہوئے باقی بچوں کے حقوق کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے کیونکہ سب بچوں کو والدین سے یکساں نسبت ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ماں ان باتوں سے قطع نظر کسی خاص بچے کی طرف میلان رکھے، ہر معاملے میں اس کو فوقیت دے اور دیگر اولاد کی حق تلفی کرے تو یہ غیر عادلانہ رویہ ہوگا۔ ماں کا اپنے بچوں سے امتیازی رویہ اور کسی ایک بچے سے کیا گیا ترجیحی سلوک بچوں میں حسد، انتقام اور رقابت کے جذبات بھی پیدا کرتے ہیں اور محبت کے بجائے نفرت جنم لیتی ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر باقی اولاد فساد کے خدشے سے احتجاج بھی نہ کر سکے تو پھر تناؤ کی کیفیت سے بچنے اور گھریلو نظام کو منتشر ہونے سے بچانے کے لیے کیا کیا جائے، جب کہ ماں کا احترام اپنی جگہ مقدم ہے؟

جواب: قرآن پاک میں والدین کے بارے میں ارشاد فرمایا: اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْ هُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا٥ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۳) ''اگر تیرے پاس ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچے یا دونوں تو ان کو اُف تک نہ کہو اور ان کو جھڑکو بھی نہیں اور ان کے ساتھ عزت سے بات کرو''۔ اس آیت میں ماں باپ کے بڑھاپے کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ بڑھاپے میں مزاج میں سختی آ جاتی ہے۔ بعض اوقات بلاوجہ بھی ماں باپ ناراض ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں فرمایا کہ پھر بھی انھیں اُف تک نہ کہو۔ ماں کا کسی ایک بیٹے کی طرف میلان ہو اور وہ اس پر اعتماد کرے اور دوسروں پر

اسے ترجیح دے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ ماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ پھر بھی ایسا کرتی ہے تو بچوں کو صبر کرنا چاہیے۔ ماں نے جوان کے لیے تکلیف برداشت کی ہے، جب وہ اس کے پیٹ میں تھے اور جب وہ اس کی گود میں تھے، اور کم از کم سات سال تک خدمت کی، جب کہ وہ خود اپنی کوئی خدمت کرنے کے قابل نہ تھے، لہٰذا ماں کے احسان کا بدلہ نہیں چکایا جاسکتا۔ بچے اگر عمر بھر والدین کی خدمت کرتے رہیں تب بھی ماں باپ کی خدمت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ماں باپ کی نافرمانی کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ آدمی ذلیل وخوار ہو، وہ رسوا ہو۔ عرض کیا گیا: یارسولؐ اللہ! کون؟ آپؐ نے فرمایا: وہ بدنصیب جو ماں باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے، پھر ان کی خدمت اور ان کا دل خوش کر کے جنت حاصل نہ کرے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے حق کو اپنے حق سے بھی مقدم رکھا ہے۔ نبیؐ نے جہاد کے مقابلے میں ماں باپ کی خدمت کو ترجیح دی ہے۔ ایک آدمی یمن سے ہجرت کر کے مدینہ آیا۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: کہ یمن میں تمھارا کوئی ہے؟ اس نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میرے ماں باپ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا انھوں نے تمھیں اجازت دی ہے؟ اس نے عرض کیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: واپس جاؤ اور ان سے اجازت مانگو۔ اگر تمھیں اجازت دے دیں تو آؤ اور جہاد میں لگ جاؤ، اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہو۔ (ابوداؤد)

اس لیے آپ ماں سے نرمی اور ادب کے ساتھ اپنا حق مانگتے رہیں۔ اگر وہ حق ادا کرے تو بہتر ورنہ صبر سے کام لیں۔ آپ کے بھائی کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے ساتھ حسد نہ کریں۔ بلاوجہ بھائی کے ساتھ حسد کرنا برادران یوسفؑ کی سیرت ہے۔ وہ حضرت یوسفؑ سے حسد کرتے تھے کہ حضرت یعقوبؑ یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔ قرآن پاک میں ان کے اس قول کو نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ (یوسف ۱۲:۸) ''یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہمارے مقابلے میں زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں''۔ اگرچہ برادرانِ یوسفؑ کو اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے یہ شکایت نہ تھی کہ وہ ان کے کسی حق کو تلف کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کھلانے پلانے،

لباس اور پوشاک اور عطیات میں مساوات کرتے تھے اور اسلام کا یہی حکم ہے کہ ماں باپ کو چاہیے کہ اولاد میں مساوات رکھیں، جانب داری نہ کریں۔ آپ کی والدہ میں بھائی کی طرف داری کی کمزوری پائی جاتی ہے۔ آپ ایک کام یہ کریں کہ اسے برداشت کریں۔ دوسرا یہ کہ والدہ کے لیے دعا کریں کہ وہ طرف داری نہ کریں۔ تیسرا کام یہ کہ اللہ رب العزت جو خزانوں کا مالک ہے اور ہمارا اور ہمارے ماں باپ کا رب ہے اور ماں باپ کے پاس تھوڑا بہت جو بھی ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے، ماں باپ تو فقیر ہیں اور محتاج ہیں اور اللہ غنی ہے۔ آپ اللہ سے مانگیں۔ اللہ اپنے خزانوں سے آپ کو اتنا کچھ دے دے گا جس کا تصور آپ اور آپ کی والدہ نہیں کر سکتیں۔ اللہ سے تعلق بڑھائیں، اس کی عبادت میں لگ جائیں۔ اقامت دین کے لیے جدوجہد کریں، اسلامی تحریک کا ساتھ دیں، ملک وملّت کی خدمت کریں۔ والدہ کی بھی خدمت کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے دلوں کو بھی ٹھیک کر دے گا اور تمام مسائل اور مشکلات کو بھی حل کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی بندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربنا کریم، واللہ اعلم بالصواب۔ (مولانا عبدالمالک)

کتاب نما

سیکولرزم، مباحث اور مغالطے، طارق جان۔ ناشر: ایمل پبلی کیشنز، اسلام آباد۔ تقسیم کنندہ:
۱۲-سیکنڈ فلور، مجاہد پلازا، بلیو ایریا، اسلام آباد۔ صفحات: ۶۴۳۔ قیمت: ۸۸۰ روپے۔/۲۰ امریکی ڈالر۔
ISBN نمبر: ۶-۰۳-۹۵۵۶-۹۶۹-۹۷۸

یورپ کی فکری تاریخ میں اٹھارھویں صدی ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس صدی میں نہ صرف یورپی تصورِ مذہب بلکہ تصورِ معاشرہ معیشت و سیاست اور ثقافت، غرض زندگی کے اہم شعبوں میں ایک نمایاں اور بنیادی تبدیلی واقع ہوئی۔ عیسائیت اور کلیسا کا اقتدار چرچ کی چاردیواری تک محدود ہوگیا اور زندگی کے دیگر معاملات کی حدبندی الگ الگ فلسفوں کے زیراثر عمل میں لائی گئی۔ اس حوالے سے ہیگل، کارل مارکس، ڈارون، ڈیکارٹس، اوگسٹ کومتے اور ہیوم اور مِل کی فکر نے زندگی کے مختلف شعبوں میں گہرے اثرات ڈالے۔ نتیجتاً مادیت، لذتیت، انفرادیت، لادینی جمہوریت، لامحدود معاشی دوڑ نے یورپی معاشرے کی اقدار میں ایک عنصری تبدیلی پیدا کی۔ بعد میں آنے والی دو صدیوں میں ان تصورات کو مزید قبولیت حاصل ہوئی اور اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یہ احساس اُبھرا کہ وہ جدیدیت جو اٹھارھویں صدی کی پہچان اور بعد کے اَدوار کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتی تھی اب ماضی کا قصہ ہے۔ چنانچہ Beyond post Modernism کا نعرہ بلند کیا گیا۔ مغرب کے اس فکری سفر میں اگر قدرِ مشترک تلاش کی جائے تو سیکولرزم یا لادینیت ان تمام تصورات میں کارفرما نظر آتی ہے۔ سیکولرزم دراصل زندگی، حقیقت اور سچّائی کو دوخانوں میں بانٹنے کا نام ہے، یعنی ایک خانہ مذہب کا اور دوسرا خانہ دنیا یا مادیت کا۔ اس تقسیم میں حقیقی عامل اور عنصر مادہ اور حِس کو تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ ہر وہ شے جو مادی طور پر یا حسّی تجربے کے نتیجے میں وجود رکھتی ہو حقیقی قرار پائی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہ اُترتی ہو

وہ واہمہ، وقتی اور غیر حقیقی سمجھ لی گئی۔ بعد کے آنے والے مفکرین خصوصاً سگمنڈ فرائڈ نے نفسیاتی زاویے سے جائزہ لیتے ہوئے empiricial reality کو بھی لاشعور اور تحت الشعور کا تابع کر دینا چاہا۔ اس پورے تہذیبی عمل میں یہ ماننے کے باوجود کہ انفرادی طور پر جو چاہے اور جس طرح چاہے اپنے مذہب پر عمل کرے۔ کاروبارِ حیات کے دروازے مذہب یعنی عیسائیت کے لیے بند کر دیے گئے، اور مذہب کو ایک ذاتی اور انفرادی عمل کا مصدقہ مقام دے دیا گیا۔

ہر شعبۂ علم اور ہر حکمت عملی کی تشکیل اسی فکری بنیاد پر رکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق و مغرب میں جس شخص نے بھی معاشرتی علوم یا طبعی و تجرباتی علوم کا مطالعہ کیا، غیر محسوس طور پر یہ بنیادی مفروضہ اُس کے ذہن اور قلب میں جاگزیں ہو گیا۔

دورِ جدید کی دو قدآور علمی شخصیات علامہ اقبال اور سید مودودی نے اس رمز کو نہ صرف پہچانا بلکہ اس کا علمی اور عقلی جواب اسلام کے جامع تصور سے فراہم کیا۔ گذشتہ ۲۰ سال پاکستان کی تاریخ ہی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس دوران سیکولرزم کو جامعات، انگریزی صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے نظریۂ پاکستان کو کمزور کرنے اور بھارتی نظریاتی یلغار کی پاکستان میں حمایت اور سرپرستی کی غرض سے ہر ممکنہ سطح پر عام کرنے کی کوشش سرکاری سرپرستی میں کی گئی۔

طارق جان نے انگریزی میں اس نظریاتی یلغار کا مقابلہ علمی اور ابلاغی سطح پر انتہائی کامیابی کے ساتھ کیا اور گذشتہ دو عشروں میں لادینیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر انگریزی میں اپنی تحریرات سے جہاد کیا۔ میری نگاہ میں ان کا تنہا کام ایک علمی ہراول دستے کے مجموعی کام سے کم نہیں کہا جاسکتا۔ میں ذاتی طور پر ان کی تنقیدی نگاہ، انگریزی زبان پر عبور و مہارت کا معترف آج نہیں، اس وقت سے ہوں جب طارق جوان تھا ــــــ بلکہ وہ آج بھی جوان تر ہے۔ بہت کم افراد ایسے ہوں گے جنھیں طارق جان نے ۴۰ سال تک گوارا کیا ہو، اور تعلقات کی گہرائی میں کوئی فرق نہ آیا ہو۔ اس لیے توصیفی و تعریفی کلمات کی جگہ ــــــ جس کے وہ لازماً مستحق ہیں، میں پورے اعتماد سے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ جدید نسل کے لیے یہ کتاب ایک لازمی مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

برادر محبّ الحق صاحب زادہ نے بڑی محنت بلکہ جان جوکھوں میں ڈال کر انگریزی کے اصل مضامین کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ میرے خیال میں اسے مزید سلیس بنانے کی ضرورت تھی۔

ترجمے کی خوبی کے باوجود جو بات اصل انگریزی مضامین کی ہے وہ اپنی جگہ مسلّم ہے۔

کتاب کا سرورق مصنف کی نصف تصویر آ جانے سے زیادہ حسین اور پُرکشش ہوگیا ہے۔

کتاب کے ناشر خصوصی طور پر مبارک باد اور ہمدردی کے مستحق ہیں جنھوں نے خود طارق جان کے بقول 'مجھے برداشت کیا مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ ایک اچھے صابر انسان کے طور پر اُبھریں گے''۔ میں عین الیقین کی حد تک طارق جان کے اس حُسنِ ظن کی تصدیق کرتا ہوں۔

کتاب ۲۸ طویل اور مختصر مقالات پر مشتمل ہے۔ ہر مقالہ پاکستان کی تاریخ میں اُبھرنے والے کسی حقیقی مسئلے سے تعلّق رکھتا ہے اور پاکستانیت اور اسلامیت سے بھرے ہوئے دل کی آواز محسوس ہوتا ہے۔ ہر باب تحقیقی حوالوں سے مزین ہے اور کتاب کے آخر میں فہرست حوالہ جات کے ساتھ مضامین کا انڈکس بھی دے دیا گیا ہے۔

یہ کتاب لادینیت کا اصل چہرہ پیش کرتی ہے اور علمی استدلال کے زور سے علامہ اقبال اور سید مودودی کی فکر کو آگے بڑھاتی ہے۔(ڈاکٹر انیس احمد)

عورت، مغرب اور اسلام، ثروت جمال اصمعی۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۴۲۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

مغربی معاشروں میں خواتین کی موجودہ حالت، اُن کے ساتھ ناروا سلوک، اور پھر اسلام اور اسلام کے معاشرتی نظام کے خلاف بلند آہنگ اشتہار بازی کے باوصف وہاں اسلام کی مقبولیت پر یہ تحقیقی کتاب، دراصل مغرب اور اسلام کے عنوان سے شائع ہونے والے علمی و تحقیقی مجلّے کی ۳۸ویں اشاعت ہے (جلد: ۱۵، شمارہ: ۱)۔

مجلّے کے مدیر پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، ابتدائیے میں لکھتے ہیں کہ ''اب بہت سے مسلم اہلِ قلم مسلم معاشروں میں خواتین کی درست اسلامی حیثیت کو اُجاگر کرنے کے بجاے، نام نہاد جدید مغربی فکر کے زیراثر انھیں کچھ 'آزاد' کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں، جب کہ اسلامی شریعت کا دائرہ نہ [خواتین کے] قیدوبند پر مبنی ہے، نہ مادر پدر آزادی پر''۔ مصنف ثروت جمال اصمعی کہتے ہیں کہ اس وقت معروضی صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے غلبے اور پھیلاؤ کے باوصف، مغربی عورت، اسلام کی طرف رغبت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ افغان طالبان کی قید

میں اسلام سے متاثر ہوکر، آزادی کے بعد، اُسے قبول کرنے کا اعلان کرنے والی برطانوی صحافی یُوآن رِڈلے کوئی شاذ اور انفرادی مثال نہیں۔ اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے باوجود، برطانیہ، امریکا اور دوسرے مغربی ممالک میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلتا جارہا ہے۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد ہر سال اوسطاً ۲۰ ہزار امریکی مسلمان ہورہے ہیں، اوران میں خواتین کا تناسب، مردوں سے چار گنا ہے۔ (ص ۱۸)

خواتین میں اسلام کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مردوزن میں مساوات کے تمام دعووں کے باوجود مغرب میں عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک عام ہے۔ برطانیہ میں ہر سال ۳۰ ہزار عورتیں، حاملہ ہونے کی بنا پر ملازمتوں سے فارغ کی جاتی ہیں (ص ۳۲)۔ پھر تنخواہوں اور دوسری مراعات میں بھی انھیں امتیازی سلوک کا سامنا ہے (ص ۳۴)۔ انھیں قُحبہ خانوں اور حماموں میں مزدوروں کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ۴۵ فی صد عورتیں کسی نہ کسی طرح گھریلو تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ جیلوں میں، فوجی ملازمتوں کے دوران، دفتروں اور تفریحی مقامات پر خواتین کے ساتھ زیادتی کے اعداد و شمار حیران کن ہیں، جو فاضل مصنف نے مغربی اخبارات اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے جمع کر دیے ہیں۔

یُوآن رِڈلے کو جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا، بلکہ طالبان کی قید سے رہائی کے بعد لندن پہنچ کر انھوں نے قرآن اور اسلام کا مطالعہ کیا، اور پھر اسلام قبول کیا اور اس نتیجے تک پہنچیں کہ ''اسلام میں فضیلت کا پیمانہ اخلاقی حُسن ہے، نہ کہ جنسی حُسن، دولت، طاقت، منصب اور جنسی کشش''۔

سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی خواہرِ نسبتی اور معروف برطانوی صحافی لارن بوتھ (Lauren Booth) نے *Why I Love Islam* میں اپنے قبولِ اسلام کی کہانی بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ جب انھوں نے اپنی بچیوں کو قبولِ اسلام کی خبر دی تو انھوں نے خوش ہوکر نعرہ لگایا: ''ہم اسلام سے محبت کرتے ہیں''۔ پھر بچیوں نے اپنی ماں سے کچھ سوال کیے۔ اُن کے آخری سوال نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ انھوں نے کہا: اب جب کہ آپ مسلمان ہوچکی ہیں تو کیا اب بھی آپ اپنا سینہ لوگوں کے سامنے نمایاں کریں گی؟'' (ص ۶۶)

مصنف نے امریکا میں اسلام قبول کرنے والی خواتین کے اپنے بیان، خود وہاں کے

محققین کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔ ان نومسلموں میں سے ایک بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ اُن کے قبولِ اسلام میں اس یقین واعتماد نے اہم کردار ادا کیا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جاتا ہے''۔ (ص ۷۸)

مغربی خواتین کے قبولِ اسلام کے اسباب میں اہم ترین، سرمایہ دارانہ نظام میں اُن کا بطور ایک جنس، استحصال ہے۔ وہاں عورت کو بھی ایک جنسِ بازار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے (یہی حال منڈی کی معیشت اپنا لینے والے دنیا کے تمام ملکوں کا ہے)۔ پھر عیسائیت میں عورت پیدایشی طور پر گناہ گار بتائی گئی ہے کہ اُسی کی وجہ سے اولادِ آدم لعنتی قرار پائی۔ اس کے برعکس اسلام نے عورت اور مرد کے جسمانی اور نفسیاتی فرق کو قبول کر کے اور ملحوظ رکھ کر دونوں کے لیے یکساں شرف اور عزت کے ساتھ ان کے متعین حقوق وفرائض بتا دیے ہیں۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے اسلامی قوانین کی رُو سے اُن کا استحصا [احاطہ] کیا ہے (اگرچہ بہت سے مسلم معاشروں میں ان کے مطابق عمل نہیں ہو رہا)۔ لیکن مغرب کی پڑھی لکھی سمجھ دار خواتین جب اس حوالے سے اسلام کا مطالعہ کرتی ہیں، اور بعض خاندانوں میں ان اسلامی تعلیمات کو عملاً مروج بھی پاتی ہیں، تو انھیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ موجودہ مسلم معاشروں میں عورتوں کے ساتھ بے انصافیاں اور دوسری خرابیاں، اسلامی تعلیمات پر عمل کی وجہ سے نہیں، بلکہ اُن سے انحراف کی وجہ سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکا کی اسلام قبول کرنے والی خواتین میں اکثریت باشعور اور پڑھی لکھی خواتین کی ہے۔

کتاب میں مندرج معلومات اور اعداد و شمار کے لیے برقیاتی ذرائع ابلاغ (ویب سائٹس) کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے، اور ان کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ان کے لیے مصنف کی دیدہ ریزی اور محنت قابلِ داد ہے۔ (عبدالقدیر سلیم)

اقبالیاتی مکاتیب اوّل، بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم۔ ناشر: الفتح پبلی کیشنز، ۳۹۲-اے، گلی ۵-اے، لین نمبر ۵، گل ریز ہاؤسنگ اسکیم ۲، راولپنڈی۔ فون: ۵۸۱۴۷۹۶۔ صفحات: ۲۹۶ مع اشاریہ۔ قیمت: ۳۶۰ روپے۔

گذشتہ سو برس سے اقبالیات، اہلِ علم و دانش میں ایک زندہ موضوع کی حیثیت سے مرکزِ نگاہ ہے۔ شعرِ اقبال، قولِ اقبال اور حرفِ اقبال کے کتنے پہلو ہیں جنھیں ہزاروں خردمندوں نے

غور و فکر کا محور بنایا۔ اقبالیاتی مکاتیب کا یہ حصّہ اوّل اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے زمانۂ طالب علمی سے اقبالیات کو اپنی محبت کا حوالہ بنایا۔ اس ضمن میں انھوں نے ذاتی تحقیق و جستجو کے پہلو بہ پہلو مختلف اہلِ علم و ہنر سے نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یہ کتاب ۴ مئی ۱۹۷۱ء سے ۲ جون ۲۰۱۱ء کی درمیانی مدت کی خط کتابت پر مشتمل ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر حمید احمد خاں، احمد ندیم قاسمی، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر جاوید اقبال، آل احمد سرور، عبداللہ قریشی، مشفق خواجہ، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، عاشق حسین بٹالوی، گیان چند، رشید حسن خاں، سعید اختر درانی، ڈاکٹر خلیق انجم، ہیرو جی کتاؤکا، ملک حق نواز، شانتی رنجن بھٹاچاریہ اور صابر کلوروی سمیت ۴۲ مشاہیر اس بزم میں شریک ہیں۔

کتاب کے بعض خطوط تو مختصر ہیں لیکن بعض کی نوعیت مستقل مضامین کی ہے۔ یہ سب اقبالیات کے کسی نہ کسی اہم نکتے کی توضیح و تشریح کے دروا کرتے ہیں۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی سلیقہ شعاری اور جزرسی نے اس قیمتی ذخیرۂ مکتوبات کی امانت کو محفوظ رکھنے کا وسیلہ بنایا۔ ان نابغۂ روزگار انسانوں کی یہ مختصر، مشفقانہ، عالمانہ اور وضاحتی تحریریں علم اور مکالمے کی ایک ایسی محفل سجاتی ہیں کہ ختم کیے بغیر کتاب چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر ہاشمی صاحب کے عزیز شاگرد ڈاکٹر خالد ندیم (سرگودھا یونی ورسٹی) نے محنت اور جاں کاہی سے اسے مرتب کیا اور اس پر حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی اس جستجو نے کتاب کے تحقیقی وزن کو دوچند کر دیا ہے۔

ادبیات کی تاریخ اور اقبالیات کی رمز شناسی کے جویا اس مجموعۂ مکاتب کو گرم جوشی سے خوش آمدید کہیں گے۔ (سلیم منصور خالد)

Calling Humanity [انسانیت کو پکارنا]، شمیم احمد صدیقی۔ ناشر: فورم فار اسلامک ورک، ۲۶۵-فلیٹ، بُش ایونیو، بروکلین، نیویارک-۱۱۲۵۵۔ صفحات: ۲۵۰۔ قیمت: ۹۵ء۱۱ ڈالر۔

شمیم احمد صدیقی کی یہ اہم کتاب پیغام دیتی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان عمومی طور پر، اور امریکا میں مختلف رنگ و نسل کے مسلمان خصوصی طور پر، اس حقیقت سے آگاہی حاصل کریں کہ اُن کی اور آنے والی نسلوں کی بقا اِسی میں ہے کہ مسلمان دین کو سمجھیں، اُس پر عمل پیرا ہوں اور اِس کی دعوت کے علَم بردار بن کر دُنیا بھر میں قرآن کریم اور اُسوۂ رسولؐ کا پیغام عام کر دیں۔

یہ تصنیف پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے آنے والے اُن مسلمانوں کی اولاد کے لیے لکھی گئی ہے جو امریکا میں مقیم ہیں اور اُردو رسم الخط سے ناواقف ہیں یا اُردو کتابیں نہیں پڑھ سکتے۔ امریکا میں دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین کی مختلف تنظیموں کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اُن پر قدرے تنقید بھی کی ہے۔

مصنف کا موقف ''دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں داعی تیار کریں'' (ص ۱۲۳) محلِ نظر ہے کیونکہ کفر اور اُس کے نمایندے سیاسی اقتدار پر قابض ہیں۔ اس لیے سیاسی جدوجہد کو ترک نہیں کیا جاسکتا، اُن کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ''دعوتی لٹریچر لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے'' (ص ۸۲)۔ امریکا میں اسلامی دعوت کا کام کریں اور راہنما کردار ادا کریں'' (ص ۲۰۵)۔ امریکا میں بسنے والے مسلمان سرگرم زندگی گزار رہے ہیں اور اُن کی صلاحیتوں کا لوہا مانا جاتا ہے۔ اُنھیں چاہیے کہ وہ بھی اسلامی تحریکات سے سیکھیں۔ امریکا میں رہنے والے مسلمان سود، مخلوط معاشرے، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور طالبانائزیشن کا مقابلہ کیسے کریں، اس کا ذکر نہیں۔ (محمد ایوب منیر)

عصر حاضر کی مجاہد خواتین، مریم السید ہنداوی۔ ناشر: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: ۳۵۴۳۴۹۰۹-۰۴۲۔ صفحات: ۲۳۲۔ قیمت: ۲۱۰ روپے۔

آج اخوان دنیا کا موضوع ہیں لیکن یہ تحریک اس سے پہلے کس کس مرحلے سے گزری، یہ حالیہ تاریخ کی ایک عجیب داستان ہے۔ اخون سے مسلسل قلبی تعلّق اور ان کے بارے میں ہمارے لٹریچر کے آگاہی دینے سے ایسا لگتا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ کی یہ پوری تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے گزری ہے۔

حسن البنا کی شہادت، چھے قائدین کو پھانسی دیا جانا، اور پھر سید قطب کی پھانسی، جیسے سب کل کی باتیں ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی کی دیارِ عرب میں چند ماہ نے پاکستان کی تحریک اسلامی کو عالمِ عرب سے، وہاں کی تحریکات سے، شخصیات سے، اہم کتب، رسائل اور فکری لہروں سے آگاہ کیا۔ پھر یہ سلسلہ مختلف شکلوں میں مختلف افراد کے ذریعے جاری رہا۔ ۱۹۵۲ء میں مصری انقلاب میں شاہِ فاروق کا تخت اُلٹ گیا، اور معروف ہے کہ ناصر اور اس کے ساتھیوں کی پشت پر اخوان تھے۔ ۲۰، ۲۵ سال میں اخوان نہ صرف مصر، بلکہ دوسرے عرب ممالک میں ایک قوت بن

چکے تھے۔لیکن پھر ناصر کے سازشی ذہن اور عالمی طاقتوں کے مفادات کی خاطر ایک جلسے میں ناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈراما رچایا گیا اور اس کا الزام اخوان پر رکھ کر پورے ملک میں جیلیں اخوان سے بھر دی گئیں اور داروگیر کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہی ہوتا گیا۔

اس دور میں اخوان پر اور ان کے قائدین پر کیا گزری، اس کی ایک جھلک ان مجاہد خواتین کے تذکرے میں ملتی ہے۔ یہ ان خواتین کی زندگی کی مختصر کہانیاں ہیں جو دراصل مصری حکومت کے اخوان اور مصری عوام کے ساتھ سلوک کا آنکھوں دیکھا بلکہ برتا ہوا مستند بیان ہے۔عموماً یہ خواتین ان قائدین کی شریکِ حیات یا بہنیں، بیٹیاں ہیں جس میں یہ تفصیل آتی ہے کہ ان کے مرد جیلوں میں بند تھے لیکن مصر کی حکومت کے ان کے اور ان کے جاننے والوں کے ساتھ کتنے سخت جابرانہ رویے تھے۔ یہ اپنے بیٹوں، عزیزوں کی رہائی کے لیے ایک سے دوسری جیل پھرتی رہیں۔شوہر کا جسد خاکی اس شرط پر باپ کو دیا گیا کہ تدفین میں کوئی عزیز شریک نہیں ہوگا۔ایک گاؤں کرداسہ کے شہدا کی لاشوں کو کئی روز تک دفن نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ بھی ہوا کہ مساجد بند کردی گئیں اور نماز پر پابندی عائد کردی گئی۔ ۱۹۴۸ء میں پہلی پابندی کے وقت جو اخوان گرفتار ہوئے اور عدم ثبوت پر رہا کردیے گئے تھے، ۱۹۶۰ء میں ان سب کو دوبارہ گرفتار کیا گیا اور پھر ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

ڈاکٹر رخسانہ جبیں نے چند جملوں میں پوری کتاب کی مکمل تصویر بیان کردی ہے: ''یہ انتہا درجے کی جدوجہد کی مثالیں ہیں کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں، غلبۂ دین کی جدوجہد کیسے جاری رکھنا ہے۔شوہر شہادت پاجائیں، جیل میں قیدوبند کی اذیتیں سہ رہے ہوں، کمسن بچے گرفتار ہو رہے ہوں، نو بیاہتا دولہا کو پولیس گھسیٹ کر لے جارہی ہو، گھروں کو اُلٹ پلٹ کیا جارہا ہو، جوان بیٹوں کو لہولہان کیا جارہا ہو، ہر حال میں صبرواستقامت کا دامن تھامے رکھنا ہے، بلکہ آلِ یاسر کی طرح اقامتِ دین کی تحریک کو اپنے خون سے سینچنا ہے''۔لاریب ان خواتین نے یہ فریضہ پوری کامیابی سے انجام دیا۔(وقار احمد زبیری)

ایفاے عہد، جنرل (ر) حمید گل، مرتب: مبین غزنوی۔ ناشر: علم وعرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ، ۴۰-اُردو بازار، لاہور۔فون: ۳۷۲۳۲۳۳۶-۰۴۲۔صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔

پاکستان کے موجودہ مسائل اور مصائب کے مختلف پہلوؤں پر زیرنظر مضامین کا مطالعہ

کرتے ہوئے ہر دردمند مسلمان اور پاکستانی محسوس کرتا ہے کہ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس میں اُمتِ مسلمہ پر نائن الیون کے ڈرامے کے دُور رس اثرات، جنرل مشرف کا پاکستان کی گردن میں امریکی غلامی کا طوق ڈال دینا، افغانستان پر امریکی حملہ، ہماری کشمیر پالیسی، پاکستان پر بھارت کا دباؤ اور اس کا قافیہ تنگ کرنے کی بھارتی پالیسی پر امریکا کی ہلاشیری جیسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

گذشتہ ۱۰، ۱۵ برسوں کے دوران میں جنرل حمید گل صاحب نے بہت کچھ لکھا۔ ان کے ایک مداح مبین غزنوی نے اخبارات میں شائع شدہ ان کے ۳۸ منتخب مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ یہ مضامین، لکھنے والے کی حب الوطنی ، پاکستان کی سربلندی، امریکی غلامی سے نجات، نہ صرف افغانستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کی امریکا سے رہائی اور بہ حیثیت مجموعی اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لیے اس کی آرزو اور تمناؤں کے ترجمان ہیں۔

جنرل صاحب کشمیر کو بجا طور پر پاکستان کی ایسی شہ رگ سمجھتے ہیں جس کے بغیر پاکستان کی بقا مشکوک ہے۔ چنانچہ زیرنظر کتاب کا سب سے بڑا موضوع مسئلۂ کشمیر ہے (۱۰ مضامین)۔ ان کے خیال میں 'خودمختار کشمیر' ایک ہلاکت آفریں سراب ہے۔ جنرل صاحب نے پاکستان کی کشمیر پالیسی کو درست سمت دینے کے لیے ۱۱ تجاویز پیش کی ہیں۔ مسئلۂ افغانستان ان تحریروں کا دوسرا بڑا موضوع ہے۔ افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت ان کے خیال میں امریکا کا چھوڑا ہوا 'شیطانی اور بے بنیاد شوشہ' ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امریکا کی رخصتی، افغان دھڑوں کا باہمی اتحاد اور نفاذِ شریعت ہی سے افغانستان میں قیامِ امن ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکا (درپردہ صہیونی) نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالمِ اسلام کو خوابِ غفلت سے بیداری اور نشاتِ ثانیہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے کوشاں ہے۔ مگر ہمارے حکمرانوں کا معاملہ وہی ہے کہ بیمار ہوئے جس کے سبب، اُسی عطار کے 'صاحب زادے' سے دوا لیتے ہیں۔ یہ مضامین جنرل حمید گل کے پیشہ ورانہ تجربے، تاریخ کے مطالعے اور حکمت و دانش کے امتزاج کے عکاس ہیں۔ انھوں نے یہ مضامین بہ تقاضاے ایمان، ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے

ہوئے لکھے ہیں۔(ر- ہ)

تعارف کتب

⊙نبویؐ اسلوبِ دعوت، سید فضل الرحمٰن، ناشر: ریجنل دعوہ سنٹر، سندھ، کراچی۔ پی ایس ۱/۵، کے ڈی اے اسکیم ۳۳، احسن آباد، نزد گلشن معمار، کراچی۔صفحات: ۴۰۔ قیمت: درج نہیں۔[نبی کریمؐ کے اسوہ کی روشنی میں دعوت کا اسلوب، حکمت دعوت، دعوت کے اصول و آداب اور تقاضوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان اصلاح طلب پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے جنھیں کارِ دعوت میں پیش نظر رکھنا چاہیے۔]

⊙وحدت اُمت، مفتی محمد شفیع۔ ناشر: دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی۔صفحات: ۶۴۔ قیمت: درج نہیں۔ [مولانا سید محمد انور شاہؒ نے فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں۔اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے، ثابت کردیں، اور دوسرے کے مسلک کو غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں (ص ۱۵-۱۶)۔اس کتابچے میں اتحاد اُمت کی اسی اہمیّت، افتراق اُمت کے اسباب، مذموم ومحمود اختلاف راے کے حدود، اختلاف راے اور جھگڑے وفساد میں فرق کو واضح کرتے ہوئے اسلام کی دعوت اتحاد کو اُجاگر کیا گیا ہے۔]

⊙پتھروں میں سوئی آوازیں، میک دزدار، مترجم: ڈاکٹر محمد حامد۔ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۵۰۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔[خوب صورت، ۱۵۰ صفحے کی کتاب پر ہر صفحے کی شاعری پڑھنے کے لائق اور قاری کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔لکھا گیا ہے کہ اُردو کے قالب میں میک دزدار جو کہ بوسنیا کے قومی شاعر ہیں کے اشعار ایسے ہیں جیسے ہم اقبال کے اشعار قالب بدل کر پڑھ رہے ہوں۔ وہ عزتِ نفس، خودی، آزادی کی تڑپ اور ایمان کے جذبے کی تحریک پیدا کرتا ہے ۔ترجمہ کار ڈاکٹر محمد حامد، قصیدہ بردہ شریف کو پانچ زبانوں میں ترجمہ کرچکے ہیں۔ روسی ترکستان کا نام بھی شامل ہے۔اس کتاب کے فلیپ پر فتح محمد ملک، کشور ناہید، امجد اسلام امجد کے کلمات درج ہیں۔]

⊙حرف کمیاب (سائنسی غزلیات)، یونس رمز۔ ناشر: عبید پبلی کیشنز، ۲۲-ای، کمرشل ایریا، ناظم آباد، کراچی۔صفحات: ۲۶۳۔ قیمت: ۳۵۰ روپے۔[سائنسی اصطلاحات کو اُردو کے پیکر میں ڈھال کر شاعری آسان کام نہیں۔شاعری ویسے بھی جگرسوزی ہے اور سائنسی شاعری تو کوئی پختہ اور قادرالکلام شاعر ہی کرسکتا ہے۔یونس رمز نے اس پیچیدہ عمل کو اپنے کارگہ فن میں ڈھالا اور خوب صورت انداز میں سائنسی شاعری کو پیرہن بخشا جو ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔کتاب سات تعارفی مضامین، دو حمد ونعت، اور ۱۰۹ سائنسی غزلیات پر مشتمل خوب صورت پیش کش ہے جس میں جابجا سائنسی اصطلاحات نگینے کی طرح جڑی نظر آتی ہیں۔]

بشیر احمد ،لاہور

'حج اور عمرہ: چند توجہ طلب امور' (اکتوبر ۲۰۱۲ء) میں سیر حاصل باتیں لکھی گئی ہیں۔ تاہم چند باتیں وضاحت طلب بھی ہیں: سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۷ کے ترجمے سے احتمال ہوتا ہے کہ حج کے دوران شاید میاں بیوی کا ازدواجی تعلق بھی اس پورے سفر میں منع ہے، حالانکہ یہ ممانعت صرف احرام کی حالت میں ہے نہ کہ سارے سفر کے دوران۔ خانہ کعبہ کے استلام کے تحت حضوؐر کے عملِ مبارک میں خانہ کعبہ کے استلام میں حجراسود کے ساتھ ساتھ رکن یمانی کا بھی لکھا ہے (ص ۵۲)، جب کہ آج کل جتنے کتابچے اور کتابیں حج اور عمرہ کے متعلق ملتے ہیں اور جو حجاج عمل کرتے ہیں اس میں صرف حجراسود کا استلام کرتے ہیں۔ 'طوافِ وداع میں سرزد ہونے والی خطائیں' (ص ۵۸) پر غالباً مصنف نے طوافِ زیارت کو طوافِ وداع لکھا ہے۔ طوافِ زیارت تو ۱۰ ذی الحج کو قربانی اور حلق کے بعد احرام کھول کر عام لباس میں مکہ مکرمہ جاکر کرنا ہوتا ہے اور پھر واپس منیٰ آجانا ہے۔

احمد علی محمودی ،حاصل پور

'میڈیا کی آزادی پر میڈیا کا شب خون' از انصار عباسی (ستمبر ۲۰۱۲ء) گھر کے فرد کی سچی گواہی ہے کہ کس طرح یہود و ہنود کے ایجنٹوں نے میڈیا کو اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ ٹی وی چینل اور اینکر پرسنز کی زبانیں بند کرنا کہ وہ فحاشی اور بداخلاقی اور غیرقانونی انڈین چینل کے موضوع پر کوئی بات نہ کرسکیں، قوم و ملک کے لیے لمحۂ فکریہ اور آزادیِ صحافت پر ایک سنگین یلغار ہے۔ ان حالات میں باضمیر اور جرأت مند مذہبی، سیاسی و سماجی رہنماؤں اور صحافیوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ میڈیا میں چھائی ہوئی فحاشی و عریانی کے خلاف بھرپور آواز بلند کریں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید ظاہر شاہ ،پشاور

انگریزی ذریعۂ تعلیم کے ذریعے جہاں انگریزی تہذیب و ثقافت بھی پھیلتی اور فروغ پاتی ہے، وہاں ہماری اپنی ثقافت و روایات بھی سکڑتی چلی جاتی ہیں۔ اب کتنے افراد ہجری کیلنڈر اور تاریخوں سے واقفیت رکھ کر ان کو اپنے خطوط اور مراسلوں میں استعمال کرتے ہیں؟ اسی طرح کتنے ہی گھرانوں میں بچے اُردو زبان کے ہندسے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں، (بجاے ابوجان اور امی جان کے) ڈیڈ اور ممی وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بچپن سے بچے کے ذہن میں یہ غلامانہ تصور بیٹھ جاتا ہے کہ دستخط صرف انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔ صرف چند کو مستثنا کرکے تقریباً تمام پاکستانی انگریزی زبان میں دستخط کرتے ہیں۔ بظاہر یہ چھوٹی چیزیں تہذیب و ثقافت اور اقدار کا خاصا بڑا حصہ بن جاتی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی تہذیب و ثقافت اور اقدار و روایات کے سب سے پہلے ہم امین بن جائیں، اور گردونواح میں اس کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔

محمد عمار فیضان ،(بذریعہ ای میل)

ہر سال حجاب ڈے کو ایک مخصوص نام اور پروگرامات کے تحت منانا کہیں اسلامی روایات میں نظر نہیں

آتا۔ آج ہم بہت مزے سے مغرب کے منائے جانے والے دنوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور اپنی نسلوں کو یہ بتاتے ہیں کہ کوئی دن محبت کا نہیں ہوتا، کوئی خاص دن ماں اور باپ کی خدمت کا نہیں ہوتا، کوئی ویلنٹائن ڈے نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ ہی سال میں ایک 'حجاب ڈے' ہوتا ہے۔

طلال، ہلال، عاکفہ، منیرہ ،اسلام آباد

کسی فلم میں ایکٹریس کا نام عائشہ، خدیجہ، فاطمہ دیکھ کر، سن کر دل کو بڑی اذیت ہوتی ہے۔ یہ اداکارائیں جو چاہیں حرکتیں کریں مگر خدا کے لیے ہم مسلمانوں پر اتنا رحم کریں کہ نام تبدیل کرلیں۔ 'فاطمہ کھاؤ' بھی تکلیف دہ ہے۔ جب کراچی میں بازارِ محمد کا اشتہار آیا تو احتجاج ہوا اور نام بازارِ فیصل کر دیا گیا!

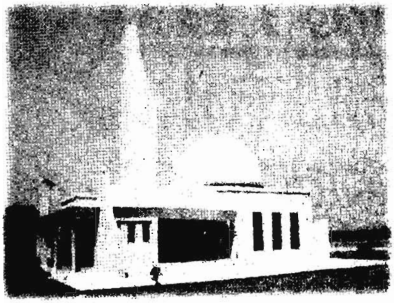
محیط اسماعیل ،لاہور

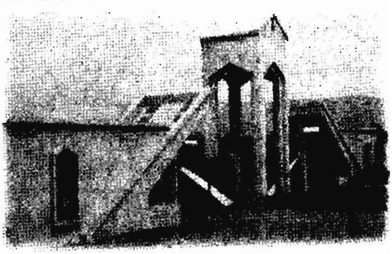
سرورق از حد پیارا اور چار رنگوں کا باوقار امتزاج لیے ایک خوش گوار تاثر چھوڑتا ہے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ اللہ کا لفظ عربی رسم الخط میں دیں۔



SINCE 1979
سنڈِپ
قدرتاً بہتر
نورس
SUNDIP
MIXED
Pickle in Oil
SUNDIP
MANGO
squash
SUNDIP
Green
CHILLI
Sauce
ORIGINAL
HOT
SPICY
250g 0.55Lbs
SUNDIP
TOMATO
Ketchup
NEW
THICK
TASTY
PREMIUM QUALITY
250g 0.55Lbs
SUNDIP
ORANGE Marmalade
www.naurus-sundip.com
Pakistan Standards

NOC-91/N-1/TP/TMA/FJ





موٹروے سٹی

ایگزیکٹو بلاک (بکنگ جاری)

محل وقوع:

نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ، جماعت اسلامی کے قرطبہ سٹی، متازہ ڈیم جیسی خوبصورت تفریح گاہ اور مارگلہ و کھیری مورت کی سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے وسط میں تعمیر ملت ایجوکیشن کے ساتھ واقع ہے۔

ترقیاتی کام:

سوسائٹی میں مین گیٹ، مسجد اور تین خوبصورت جھیلیں مکمل ہو چکی ہیں۔ 200 کنال پر محیط خوبصورت پارک کی تعمیر جاری ہے اور ماڈل گھروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ ایک فیز کی پلاننگ مکمل کر کے ممبران کو قبضہ دیے جا رہے ہیں۔

قطبال ٹاؤن

اسلام آباد

(بکنگ جاری)



محل وقوع: یہ اسلام آباد ہائی وے سے 800 گز کے فاصلے پر کھنہ ایسٹ میں پہلے سے موجود آباد رہائشی سکیموں کے جھرمٹ میں واقع ہے۔ اسلام آباد ہائی وے، لہتراڑ روڈ اور کھنہ پل سے قریب ہونے کی وجہ سے 24 گھنٹے ٹرانسپورٹ کی سہولت۔

ترقیاتی کام: یہاں تمام بنیادی سہولیات بجلی، پانی اور گیس وغیرہ پہلے سے موجود ہیں اس کے علاوہ یہ سکیم انڈر گراؤنڈ سیوریج اور باؤنڈری وال سے آراستہ ہے۔ یہاں بنیادی سہولیات کی دستیابی و ترقیاتی کام مکمل ہونے کی وجہ سے آپ فوری رہائش رکھ سکتے ہیں، گھروں کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

ضرورت نمائندگان:

ملک بھر سے پلاٹوں کی بکنگ کے لیے نمائندوں / کمیشن ایجنٹس کی ضرورت ہے۔ پرکشش کمیشن پیکج دیا جائے گا۔

[illegible] U.A.N: 051-111-700-400. 051-5961923,5961682

Fax 051-59622[illegible] Email [illegible]

مدیر کے نام

دانش یار ،لاہور

سید منور حسن صاحب نے 'اشارات' (اکتوبر ۲۰۱۲ء) میں بجا توجہ دلائی ہے کہ توسیع دعوت کے لیے اپنے لٹریچر کا مطالعہ، انفرادی ملاقاتیں اور منصوبہ بندی سے شخصی اور انفرادی رابطے کے بغیر منظرنامۂ عالم پر جماعت اسلامی اپنا وجود ثابت نہ کرپائے گی۔

راجا محمد ظہور ،چیچہ وطنی

'اسلام اور ناموسِ رسالتؐ پر کروسیڈی حملے اور اُمت مسلمہ کی ذمہ داری' (اکتوبر ۲۰۱۲ء) بڑا مدلل اور اپنے موضوع پر جامع تجزیہ ہے۔ مصر کے حالات کے متعلق اخبارات میں متضاد چیزیں آتی رہیں، لیکن ارشادالرحمٰن نے مصر کے پوست کندہ [بےلاگ] حالات ہمارے سامنے رکھ دیے جس سے مکمل معلومات حاصل ہوئیں۔

عبدالرشید عراقی ،سوہدرہ، گوجرانوالہ

'حمیدہ قطب بھی چل بسیں' (اکتوبر ۲۰۱۲ء) میں اُن کے برادر سید قطب شہیدؒ کی حق گوئی اور اُن کی استقامت وعزیمت کی مثال بڑی اہمیّت کی حامل ہے۔ حق وصداقت کے پیش نظر شہادت کو قبول کرلیا لیکن اپنی زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کیا۔ اسی طرح حمیدہ قطبؒ نے بھی اپنے اُوپر لگائے گئے الزامات کو قبول کرلیا، مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی، اور دونوں بہن بھائی اپنی زندگی کا بیش تر حصہ جیل کی سلاخوں میں گزار کر اپنا نام تاریخ میں ثبت کرگئے۔

حافظ افتخار احمد خاور ، لاہور

'مصر، اخوانی صدر کے فیصلے اور کارکردگی' (اکتوبر ۲۰۱۲ء) نظر سے گزرا۔ اخوانی صدر کے فیصلے یقیناً مصری عوام کے لیے ایک نعمت غیرمترقبہ ہیں۔ مصری عوام کو بھی ڈاکٹر محمد مُرسی جیسے اسلام پسند اور جرأت مند صدر کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

زاہدہ حمید، کراچی

'حج اور عمرہ: چند توجہ طلب اُمور' (اکتوبر ۲۰۱۲ء) اہم مضمون ہے اور عملی مسائل کے حوالے سے رہنمائی دی گئی ہے، تاہم بروقت ہونا چاہیے تھا۔ اب تو لوگ حج کے لیے روانہ ہوچکے ہیں، استفادہ نہ کرسکیں گے۔ حج سے متعلق تحریریں حاجیوں کی روانگی سے قبل شائع ہوں تو زیادہ مفید ہوں۔

بیٹھک اسکول نیٹ ورک

سوسائٹی فار ایجوکیشنل ویلفیئر پاکستان

اپیل

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بیٹھک اسکول نیٹ ورک 1996 سے اسلامی اقدار پر مبنی رسمی تعلیم کے ذریعے انفرادی اصلاح اور صحت مند معاشرے کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ پاکستان کے تمام صوبوں میں 134 اسکولوں میں 14400 غریب نادار، یتیم اور مزدور بچوں کو پرائمری سطح پر فنون و تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہا ہے۔ ان اسکولوں میں 700 سے زائد خواتین اساتذہ تدریس کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ بیٹھک اسکول سے فارغ التحصیل طلباء وطالبات ایک بڑی تعداد سیکنڈری اور کالج کی سطح پر تعلیم حاصل کرکے باعزت روزگار کمار ہے ہیں۔

بیٹھک اسکول نیٹ ورک کے زیر اہتمام 134 اسکولوں کے معیار کو مزید بہتر بنانے کے لیے اسٹوڈنٹ چیر، ڈیسک، ٹیچرز ٹیبل، الماریاں، ، پنکھے، پانی کی موٹر، بلیک بورڈ، سکولوں میں رنگ و روغن، واٹر کولر، چٹایاں، اسکول بورڈ کی ضرورت ہے جس کی لاگت کا تخمینہ 78 لاکھ روپے ہے۔

بیٹھک اسکول نیٹ ورک کے ساتھ تعاون آپ مندرجہ ذیل صورتوں میں بھی کر سکتے ہیں:

۱: ایک طالب علم کا سالانہ خرچ	5400 روپے
۲: ایک اسکول کا سالانہ خرچ (اوسطاً 100 طالب علم)	540,000 روپے
۳: تربیت اساتذہ ماہانہ خرچ	90,000 روپے

محترم خواتین و حضرات بیٹھک اسکول نیٹ ورک کی تمام کامیابیاں آپ کے دیے ہوئے عطیات سے ممکن ہوئی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی آپ کا تعاون پاکستان کے تعلیم سے محروم بچوں کی دعاؤں کو عملی تعبیر دے کر معاشرے میں پھیلے جہالت کے اندھیروں کو دور کر سکتا ہے۔

اپنے عطیات (زکوٰۃ وصدقات بھی دیے جا سکتے ہیں) مندرجہ ذیل اکاؤنٹس میں براہِ راست جمع کروا سکتے ہیں:

FAYSAL BANK: US $ account# 118162004, Abdullah Haroon Road, Karachi. Pakistan. Swift Code: FAYSPAKKA

MEEZAN BANK: PKR Account# 0103-0100019289, FTC Building Branch, Shahra-e-Faisal, Karachi, Pakistan. Swift Code: MEZNPKKA

برائے رابطہ ومعلومات:

محمود احمد فاروقی

شعبہ تعلقات عامہ موبائل: 0300-5076650

Email: mahmudfarooqi@yahoo.com

Sewpromotion@gmail.com

ملتمس

مسز عاطف

صدر

سوسائٹی فار ایجوکیشن ویلفیئر

بیٹھک اسکول نیٹ ورک۔ پاکستان

www.sewpak.com, facebook.com/sewpak, twitter.com/ngosew, youtube.com/baithakschool, 0312-7397251-2

Head Office: C-8 Sector 16-A Government Teacher's Cooperative Society, Scheme 33, Gulzar-e-hijri, near Kaneez Fatima Society, Karachi

مرزا محمد الیاس نے ارقم آفاق پرنٹر، بلال گنج سے چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

C.P.L. 322 *Monthly* AALMI TARJUMAN - UL - QURAN LAHORE. Ph: 3758 7916 3753 5660